جلد ۱۰۷ مئی ۱۹۸۷ء عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارہ ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور

حکمتِ تبلیغ

از :

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ترتیب وتدوین :

سیّد اسعد گیلانی

- ۹ سال کی محنت کا ثمرہ
- تازہ ترین دینی مواد
- تفہیم القرآن کی چھ جلدوں اور مولانا محترمؒ کے وسیع لٹریچر کا نچوڑ
- دعوتِ دین کا کام کرنے والوں کے لیے رہنما دستاویز
- وہ تدابیر جن سے انسان دعوتِ حق سے متاثر ہوتا ہے
- وہ حکمتیں جو انسان کی حق کی طرف رہنمائی کرتی ہیں
- وہ نفسیاتی طریقے جن سے گمراہیاں چھٹ جاتی اور روشنیاں راستے واضح کر دیتی ہیں

بڑے انتظار کے بعد

بڑی محنت کے بعد

بڑی کاوشوں کے بعد —— بالآخر کتاب **حکمتِ تبلیغ** میدان میں آگئی ہے،

جو ہر مبلغِ دین کی ساتھی، رفیق اور رہنما کتاب ہے۔

ضخامت : ۳۲۰ صفحے سائز : ۲۳×۳۶/۱۶ قیمت ۴۵/- روپے

ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۰۷ | مئی ۱۹۸۷ء مطابق رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ | عدد ۳

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون نمبر:- ۶۸۶۳۶ ——— ۳۲۴۴۶۸

زرِ سالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے اے ایچ نارون ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

رمضان کے مبارک مہینے کا خیر مقدم ۱۵ شعبان سے شروع ہو جاتا ہے۔ لاکھوں کروڑوں اہلِ ایمان کے ساتھ میں بھی اس قافلۂ خیر و برکت کا استقبال کرتا ہوں۔ یہ دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ اس ایمانی و تعبدی اور روحانی و اخلاقی ابرِ بہاری کی گہر پاشیوں سے تمام اہلِ ایمان، تمام خادمانِ دین، تمام احبّا و اصدقا اور تمام محسنوں اور خیر خواہوں کے ساتھ مجھے بھی دامنِ شوق بھر لینے کی توفیق دے۔

یہ تھوڑا سا وقت آئے گا اور جلد گذر جائے گا، مگر کتنے ہی اربابِ شوق کے سینوں میں یہ صبر و تقویٰ کے فانوس روشن کر جائے گا اور کتنے ہی مستانِ ہوس کے چہروں پہ کلونس چھوڑ جائے گا۔

قیامت میں کچھ لوگ ہوں گے جن کے لیے روزہ سفارشی بن جائے گا، اور کچھ وہ ہوں گے جن کے منحرفانہ رویے کی وجہ سے وہ ان کی سزا کا باعث بنے گا۔

میرا یہ عجیب مشاہدہ ہے کہ ہمارے وہ مسلمان بھائی جو سارا سال بظاہر خدا فراموش اور تارکِ دین دکھائی دیتے ہیں، ان کی ایک بڑی تعداد کی حالت رمضان کے ہلال کی جلوہ فشانی کے ساتھ ہی یکایک بدل جاتی ہے۔ جگہ جگہ بے شمار نئے لوگ مسجدوں کی طرف ٹوٹ پڑتے ہیں۔ گھر گھر سے قرآن پڑھنے کی صدا بلند ہونے لگتی ہے۔ سحری کے وقت دُور دراز دیہات میں بھی ہر طرف چولہوں اور تنوروں میں بھی آگیں جلنے لگتی ہیں۔ افطاری کی تیاری کے لیے چہل پہل شروع ہو جاتی ہے۔ خیرات و صدقات دیئے جانے لگتے ہیں۔ لوگ دوسروں کو افطاریاں کراتے ہیں۔ مسجدوں میں سامانِ افطار بھجواتے ہیں، دوستوں اور

عزیزوں کو بھی اور غربا کو بھی کھانا کھلاتے ہیں۔ تراویح کے لیے بڑی مسجدوں میں کئی کئی صفیں کھڑی ہوتی ہیں اور بیشتر مقامات پر مہینے میں پورا قرآن سنانے کا انتظام ہوتا ہے۔ بالعموم روزہ داروں میں عام حالات کے مقابلے میں حرام سے بچنے اور بدگوئی اور جھگڑے سے احتراز کرنے کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ یعنی روزہ دار کو گناہوں کے حملے سے بچنے کے لیے ڈھال مل جاتی ہے۔

لادینیت پسند قوتوں اور سیکولرسٹ سیاست بازوں اور بدآموز ذرائع ابلاغ کی اُگائی ہوئی جو زہریلی فصل چاروں طرف پھیل چکی ہے، رمضان کا سیلِ نور اس کے اثرات کے بڑے حصے کا صفایا کر جاتا ہے۔ رمضان کے دوران میں طاغوتی رجحانات دب دبا کر چھوٹے موٹے رخنوں میں سے کام کرتے رہتے ہیں۔ مگر کھلے بندوں وہ اپنی دکانیں رمضان کے رخصت ہونے پر ہی لگاتے ہیں[1]۔ اسی طرح علاقائیت اور لسان پرستی اور نسل و خاندان کا غرور و امتیاز اُس دن ملیامیٹ ہو جاتا

---

[1] حدیث کا یہ بیان برحق ہے کہ رمضان میں شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں، مگر یہاں مراد شیاطین جن ہیں، کیونکہ شیاطین انس تو ہمارے سامنے موجود رہتے ہیں۔

یعنی اصل طواغیت و شیاطین نے جو کام پہلے سے کر رکھا ہوتا ہے۔ وہ کام جاری رہتا ہے۔ مثلاً قسم قسم کی بدعقیدگیاں، قسم قسم کے فاسد افکار، قسم قسم کے مکروہ عادات، جرائم اور حرام خوری کی علتیں جو برسوں کی محنتوں سے شیاطین نے پیدا کی ہوتی ہیں۔ بس یک قلم میٹ نہیں جاتیں۔ بس ان کا زور کم ہو جاتا ہے اور ان کے مقابلے میں قوتِ خیر پہلے سے زیادہ مضبوط ہونے لگتی ہے۔

اسی طرح شیاطینِ جن نے جو شیاطینِ انس پیدا کیے ہوتے ہیں وہ معاشرے میں موجود رہتے ہیں جن اداروں کو انھوں نے اپنے ڈھب پر تیار کر دیا ہے، یا جن کے اندر خرابیوں کے جال پھیلائے ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ بھی کالعدم نہیں ہو جاتا ہے۔

روزہ دار کو ان بلاؤں سے عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔ ورنہ رمضان میں کوئی آزمائش رہے ہی نہیں۔

ہے۔ جس دن دنیا بھر کے علاقوں سے مختلف بولیاں بولنے والے اور کئی نسلوں اور خاندانوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک ہی مرکزِ توحید پر جمع ہو کر ایک جیسے جامۂ احرام میں بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے لبیک اللّٰھم لبیک کہتے ہیں۔ اور مل کر منٰی و عرفات اور مزدلفہ جاتے ہیں اور قربانیاں پیش کرتے ہیں۔

جو حکومتیں اسلام کا راستہ روکے کھڑی ہیں، جو لادین قوتیں اسلامی قانون کو پاس نہیں ہونے دیتیں، اور جو کمیونسٹ اور ملحد عناصر مسلمان قوم کو بگاڑ کر پاکستان کی غایتِ وجود کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اور نتیجۃً اس وجود کی وجہِ جواز کی نفی کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں جاننا چاہیے کہ یہ نمازیں اور روزے اور حج اور صدقات، قرآن اور حدیث کے علوم، ہماری چودہ سو سال کی تاریخ —— اور اس کے ساتھ جڑی ہوئی لمبی تاریخِ انبیاء، ہماری تقریبیں، ہمارے شعائر، ہماری اقدار اور ہماری روایات اتنی بڑی قوت ضرور ہیں کہ وہ مطالبۂ نظامِ اسلامی اور تقاضائے نفاذِ قانونِ اسلامی کے لیے بار بار افراد اور جماعتوں اور تحریکوں کی لہریں اور ریلے اٹھاتی رہیں گی، اور ایک نہ ایک ریلے میں تمہارے قدم اکھڑ جائیں گے اور جب تک نہیں اکھڑیں گے، اسلامی تحریکیت کے ریلے تمہیں کوئی سکھ کا سانس نہیں لینے دیں گے۔

ماہِ رمضان بجائے خود لادینیت پسندوں کے لیے ایک زبردست تھپیڑا ہے۔

مقامِ افسوس ہے کہ یہ مقدس وقت جب کہ رمضان کا ابرِ رحمت ہمارے سروں پر چھایا ہوا ہے، جونیجو صاحب نے برطانیہ میں مغربی طاقتوں کو یہ تسلی دلائی ہے کہ ہمارے ہاں شریعت وغیرہ نہیں آئے گی، ایسے کسی بل کے پاس ہونے کا خطرہ نہیں ہے، اور تم مطمئن رہو کہ ہم اسلام کو حکومت و عدالت کے دائرے میں گھسنے نہیں دیں گے۔ ؎

مرے اسلام کو اب قصۂ ماضی سمجھو   ہنس کے مس بولی تو بس مجھ کو بھی راضی سمجھو

آہ ماہِ رمضان ــــــ مغربیت کی "مِس" ــــــ جونیجو صاحب ــــــ مسلم لیگ ــــــ اور "پاکستان کا مطلب کیا، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ"!

یا اللہ! اپنے بھیجے ہوئے ماہ رمضان کی برکت سے ہم فدا کارانِ محمدؐ کو غیر مسلموں کے سامنے ذلیل ہونے سے بچایئے!

تصحیح

ترجمان القرآن ماہ اکتوبر ۱۹۸۶ء، شمارہ ۱۰۶ عدد میں ایک مضمون مولانا میر محمد حسین صاحب کا شائع ہوا ہے۔ اس میں سورۃ توبہ کی آیت ۳۷ کے اندراج میں ایک لفظ کی فاش غلطی ہوئی مگر نہ صاحبِ علم مضمون نگار کو توجہ ہوئی، نہ کاپی پڑھنے والے رفیق کو اور آیت بدل کی توں چھپ گئی۔

اصل میں قرآن کی عبارت تھی فَيُحِلُّوا مَا حَرَّمَ اللهُ، مگر لفظ حَرَّمَ کی جگہ اَحَلَّ چھپ گیا جس سے مطلب ہی اُلٹ جاتا ہے۔

اِس غلطی پر ہمیں بشیر فرخ صاحب نے ابوظہبی سے تازہ خط میں مطلع کر کے بڑی نیکی کی۔ ان کے احسانات کے مطابق ہم سب لوگ جن کا تعلق کسی بھی حیثیت سے میر صاحب کے محولہ مضمون سے ہوا، اپنی کوتاہ کاری پر خدا سے طلب عفو کرتے ہیں۔ خصوصاً راقم مدیر سب سے بڑھ کر اس غلطی کا ذمہ دار ہے۔ وہ بھی خدا سے استغفار کرتا ہے۔ بشیر صاحب بھی ہمارے لیے دعا کریں اور دوسرے حضرات بھی۔ نیز اپنے اپنے رسالوں میں تصحیح کر لیں۔

واضح رہے کہ اس قسم کی غلطیاں بالارادہ اور کسی منصوبہ کے تحت نہیں کی جاتیں، بلکہ کوتاہی یا نادانستہ لغزش کی تعریف میں آتی ہیں۔ جان بوجھ کر کوئی مسلمان اپنی طرف سے قرآن کا کوئی لفظ نہ بدلتا ہے اور نہ پاس سے ڈالتا ہے۔ (ادارہ)

سانحات و وفیات

(ادارہ)

پچھلے شمارے کی اشاعت کے بعد سب سے بڑا سانحہ اس ملک میں علامہ احسان الٰہی ظہیر اور ان کے ہم سفروں کا وہ شدید ابتلا ہے جس میں علامہ صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن یزدانی کے علاوہ ۸ شہدا کے جنازے بیک وقت پڑھے گئے۔ بعد میں ایک اور صاحب شہید ہو گئے اور زخمی تو بہت زیادہ تھے۔ مقام گفتگو اور دلیل کا تھا اور دشمنانِ دین و وطن نے بارود اور آگ کا ماتمی کھیل رچایا۔ ایمان کا توڑ سپر پاورز کے پاس بھی بارود کے سوا کچھ نہیں، مگر نخلِ ایمان پھر نخلِ ایمان ہے ——

"برق گرتی ہے تو کچھ اور ہرا ہوتا ہے۔"

ایک بات ہم وضاحت سے کہہ دینا چاہتے ہیں کہ علمائے دین میں سے کسی کو ہم سے کچھ بھی اختلاف ہو اور خواہ ہمارے لیے سخت ترین نقطۂ نظر اور تلخ ترین اندازِ بیان رکھتا ہو، ہم ان کے احترام کو معاشرے میں قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اور ان کو اگر اختلافات یا انتقام یا تحزب کے تحت کوئی نشانہ بنائے تو ہم ایسی حرکت کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ طاغوتی طاقتیں اسلامی قوتوں کو برباد کر کے جبراً ہم کو لادینیت میں جکڑ دینا چاہتی ہیں۔ مگر ایسا کبھی نہ ہوگا، فتنہ گر اور سازشی اور قاتل اور تشدد کیش قوتیں خائب و خاسر ہوں گی۔

زندہ جمہوری حکومتیں اپنی تیز بین نگاہوں سے ایسے کرب انگیز جرائم کے مجرموں کو سات براعظموں کے آخری سروں تک دیکھ لیتی ہیں۔ اور اپنے لمبے بازوؤں سے وہ انہیں مشرقین و مغربین سے کھینچ بلاتی ہیں۔ مگر یہاں کی اعجوبگیوں کو سمجھنے کی لیاقت ہم نہیں رکھتے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے بھائی اور دوست علامہ احسان الٰہی ظہیرؒ کی روح کو شاداب رکھے، وہی رب رحیم چمکتے چہرے والے مولانا یزدانی پر رحمتیں نازل کرے، وہ ان کے ساتھی تمام شہدا کی مغفرت فرماکر درجاتِ اعلیٰ نصیب کرے، اور وہ اس سانحۂ بارغ بیتا رہ پاکستان کے تمام زخمیوں کو صحت و قوت اور سکون و اطمینان عطا کرے۔ وہ شہدا اور زخمیوں کے لواحقین اور ان سے وابستگی رکھنے والے تنظیمی حلقے کے فرد فرد کے حزن و ملال کی تلافی بعض خاص عنایات و برکات کے ذریعے فرمائے۔ علاوہ ازیں وہ ایسے جرمِ شنیع اور ظلمِ قبیح کے مرتکبین سے لے کر اس کے سوچنے والوں تک ہر متنفس کو اسی دنیا میں نشانِ عبرت بنائے۔

ایک چیز میں نہایت خیر خواہی و دردمندی سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ جنازۂ شہدا سے پہلے مجمع کے سامنے علماء نے پرزور تاکید کی کہ جلوس پرامن ہوگا اور کوئی شخص توڑ پھوڑ نہ کرے، مگر جنازے سے فارغ ہوکر جونہی جلوس چلا تو میری آنکھوں کے سامنے بے شمار ڈنڈہ بردار (اور بعض مشکوک ایرداز) نوجوان تیزی سے آگے بڑھے اور کارپوریشن کی پانی کی گاڑی پر حملہ آور ہو گئے۔ اور یہ سلسلہ چل پڑا۔ ہزار غنیمت کہ ہم جان بچا کر ایک طرف ہو گئے۔ دینی جماعتوں کے لیے یہ بڑی بدنام کن صورت ہے۔ جلوسوں میں جب کبھی ایسا ہونے لگے تو جلوس کے خاتمے کا اعلان کر دیا جائے۔ اور توڑ پھوڑ کرنے والوں کو خود پکڑ کر پولیس کے حوالے کیا جائے۔ اگر وہ اپنی تنظیم کے ہوں تو ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے۔ ورنہ مذہبی تنظیموں کے لیے یہ باتیں سامانِ بدنامی ہیں۔

اس دور کے منکرینِ خدا نے انسان اور معاشرے کی حقیقت کے متعلق ایسے ایسے حیوانی اور مشینی نظریے قائم کیے ہیں جنہوں نے آہستہ آہستہ آدم زاد کو بالکل درندہ صفت بنا دیا ہے۔ اور اس کے قلب و ضمیر کو پتھر کر دیا ہے۔ اس کے شواہد پشاور سے اسلام آباد تک اور لاہور سے کراچی تک بار بار سامنے آرہے ہیں۔

انہی نظریہ کے سرپرستوں کے مختلف کرتوتوں میں سے ایک وہ بھی ہے جو کشمیری بازار راولپنڈی میں بم کے پھٹنے کی صورت میں سامنے آیا۔ خون، آگ، لاشیں، دکانوں اور مکانوں کے پرخچے اڑنا، انسانوں کے بکھرتے اعضا، اڑتی بوٹیاں، حواس باختہ بچے، پریشان حال باپ اور مائیں ــ اور

بیخ پکار کا طوفان برپا ہو گیا۔

۱۵، ۱۶ بے گناہ انسانوں کی ہلاکت اور یک صد زخمیوں کا درد و اذیت کی چکی میں پسنا، راولپنڈی کے دلوں کو ہی نہیں، تمام اہل پاکستان کے دل ہلا گیا۔

حکومت اور دوسرے حکومت اور دیگر کارپردازا احساس کریں کہ اُن کا فرض کیا ہے؟ قانون متوجہ ہو کہ انسانوں کو ایسی تباہی سے تحفظ دلانے کے لیے وہ کیا کر سکتا ہے؟ قانون کو چلانے والے اداروں کا فرد فرد سوچے کہ ایسے جرائم کے مرتکبین کو پکڑنے اور ان کو عبرت ناک سزائیں دینے اور معاشرے کو آئندہ کے لیے ایسے سانحات سے بچانے کی تدابیر کیا ہیں؟ اور ہر شخص کی آخرت میں ذمہ داری اور جوابدہی کیا ہو گی؟

تعلیم اور ابلاغ کے ذرائع یہ بھی سوچیں کہ جدید دور کے ظلم کیش، اسیرِ ہوس اور اندھے انسان کو بنانے میں ان کا کتنا حصہ ہے؟

آخر میں عرض ہے کہ ہمارے بس میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم مظلوموں کے لیے خدا کی رحمت طلب کریں اور ظالموں کو اس کے غیر مرئی نظامِ انصاف کے سپرد کر دیں۔ تمام وفات یافتگان کے لیے ہم مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ تمام زخمیوں کے لیے ہم بحالی صحت و قوت کی آرزو کرتے ہیں۔ اور وہ نقصانات جو قطعی طور پر واقع ہو چکے ہیں ان کے متعلق ہم اللہ تعالیٰ سے اس بات کے آرزومند ہیں کہ وہ متاثرین اور ان کے لواحقین کو کچھ دوسرے پہلوؤں سے خصوصی عنایات سے بہرہ مند کرے۔

"میری وفاداری پاکستان —— اسلام —— اور پاکستان کے عوام سے ہے۔"

وقت کے ایوان میں بار بار گونجنے والے یہ الفاظ جس شخصیت نے ایک انٹرویو میں کہے تھے، وہ میر غلام علی تالپور کے نام سے موسوم تھی۔

ان کی کچھ اور باتیں بھی سنیے:

"میں جب ۱۸ برس کا تھا تو ایک دن نوکروں کی گفتگو میں سنا کہ قرآن تو بحرِ ذخار ہے۔ میں نے سوچا کہ پڑھ کر تو دیکھوں .... میں نے یہ ترجمہ (سندھی میں مولانا تاج محمد امروٹی نے ترجمہ کیا تھا) منگوایا اور ایک ماہ میں پورا پڑھ ڈالا۔ اس کے بعد مت پوچھیے کہ قرآن پاک نے میری زندگی میں

کتنے اثرات مرتب کیے۔"
اکثر ممتاز شاعروں، ادیبوں سے ان کی دوستی مخفی تھی کہ جوش صاحب نے تو ان کو "نباضِ سخن" کا خطاب دیا۔
ایک قول کے مطابق وہ مزاجاً خاکسار، ارادۃً اعرار اور طبعاً حریت پسند تھے، مسلم لیگ کے جاگیردارانہ مزاج سے کوسوں دور۔
۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۷ء تک پیپلز پارٹی کا عرصہ اقتدار میر برادران نے ابتلا و آزمائش میں گزارا۔
آخر میں اگرچہ وہ اچھی توقعات کے ساتھ صدر ضیاء الحق کی کابینہ میں شامل ہوئے مگر فروری ۱۹۸۵ء کے الیکشن میں ہارنے کے بعد کنارہ کش ہو گئے۔
میر صاحب کی شخصیت میں خیر کا عنصر غالب دکھائی دیتا ہے، سو ہم اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہیں کہ وہ ان کی نیکیوں کو زیادہ وزن دے کر قبول کرے اور ان کی کمزوریوں اور کوتاہیوں سے درگذر فرمائے۔

اِدھر میاں محمود علی قصوری ایڈووکیٹ کا انتقال ہزاروں دلوں کو ہلا گیا۔ میاں صاحب نہ صرف ایک کامیاب وکیل تھے اور عدالت کے ایوان میں ان کی پُر زور آوازیں جمہوریت، قانون کی حکمرانی اور تحفظِ حقوق کے لیے گونجا کرتی تھیں، بلکہ ان موضوعات سے متعلق سیاسی مقدمات اور نظر بندوں کی ہیبیس کارپس کی درخواستوں کے لیے وہ بغیر طلبِ معاوضہ کے اپنی خدمات پیش کیا کرتے تھے۔ اور اس معاملے میں ان کی قانونی لڑائی کسی خاص نظریے یا پارٹی کے لیے مخصوص نہ تھی۔ مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ جماعت سے متعلق ایسے بعض مواقع پر بھی عدالتی میدان میں وہ ہماری طرف سے خم ٹھونک کر اترے۔ اس طرح ہم لوگ بھی دوسرے بہت سے افراد اور گروہوں کی طرح ان کے احسان مند ہیں۔ یہ گویا دستوری اور قانونی لحاظ سے حق کے تحفظ کے لیے معرکہ آرائی تھی۔ اس معاملے میں انہوں نے کسی طرح کے گروہی تعصب کا کبھی مظاہرہ نہیں کیا۔
ان کے سوشل روابط کا دائرہ بھی بہت وسیع تھا۔ ہر طبقے اور دائرے کے لوگ ان سے

ملتے ملاتے اور وہ مختلف مجلسوں اور تقریبوں میں شریک ہوتے ۔ تعلقات کے لحاظ سے بھی کوئی تعصب ان کا راستہ روکنے والا نہ تھا ۔ جاگیردار، فوجی اور سول عہدہ دار، سیاسی لیڈر، مذہبی جماعتوں کے اکابر، مزدوروں کے لیبر لیڈر، کسانوں کا جھنڈا بلند کرنے والے، کمیونسٹ پارٹی کے کرتا دھرتا، اہل حدیث کے علماء، وکلا، خواتین غرضیکہ ان کے تعلقات ہر طرف تھے ۔

وہ معروف اہل حدیث میں پیدا ہوئے، بعد میں اگرچہ ان کا جھکاؤ بائیں جانب کے نظریات کی طرف ہوا ۔ مگر شاید وہ اسی سبب اس طرف پوری طرح نہ لڑھک سکا کہ ان کے دل میں خاندان کی روشن کردہ شمعِ ہدایت کبھی بجھی نہیں ۔ پہلے وہ بحرِ سیاست کے کنارے سے سیر دیکھا کرتے تھے ۔ پیپلز پارٹی کے عہد میں طوفان میں کود گئے ۔ مگر پلے خس و خاشاک ہی، گوہر و مرجان نہیں ۔ پس بعد کے دور میں وہ شاید اپنے پچھلے متضاد رویوں کی وجہ سے بہت حساس ہو گئے تھے اور ان پر اکثر رقت طاری رہتی تھی ۔ آدمی کا دل جب پگھلنے لگتا ہے تو اس کے آنسو محض آنسو نہیں ہوتے بلکہ کبھی کبھی ذکرِ الٰہی کی تسبیح کے دانے بھی بن جاتے ہیں ۔ ہم کسی شخص کی دنیائے باطن کو زیادہ جان نہیں سکتے، بس کچھ علامات ہی سامنے آتی ہیں ۔ مولانا مودودیؒ سے نہ صرف ان کے تعلقات تھے بلکہ ان کے مرتبے کا بڑا احترام کرتے تھے ۔

خدا سے ہم درخواست کرتے ہیں کہ قصوری صاحب اور دوسرے تمام لوگ جو اہل ایمان میں سے ہیں ۔ اور جن کو ماحول کے طوفانِ نظریات نے پریشان کیے رکھا، ان کے اندر کی شمعِ ہدایت کی ذرا سی بھی ٹمٹماہٹ اور ان کے آنسوؤں میں خوفِ خدا کی ذرا سی بھی جھلملاہٹ کو قبول فرما کر تو ان کو اپنی بخششوں سے ڈھانپ لے ۔

ہم اپنے ایک پیارے ساتھی ملک عزیز الرحمٰن کی مغفرت کی دعا بڑے دکھی دل کے ساتھ کرتے ہیں ۔ جنھوں نے مشغلے کے طور پر اپنی عمر محکمہ آب پاشی میں سول انجینئر کی حیثیت سے گزاری اور اس وقت وہ راجن پور میں ضلعی امیر کی حیثیت سے جماعتِ اسلامی کی دعوت و تحریک کی خدمت کر رہے ہیں ۔ ان کی محبتِ دین اور خدمتِ جماعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ حالیہ

اجتماع پنجاب (منعقدہ لاہور) میں اپنے ضلعی ارکان کی تعداد سے ۴ گنا تعداد شرکا دور دراز کا سفر کر کے لائے تھے۔ انہوں نے نظم کو بہت معیاری حیثیت دے دی تھی۔ یہاں سے واپسی کے بعد وہ حیدر آباد میں ہونے والے اجتماع کے لیے اپنے ساتھ ایک بڑی تعداد لے جانے کی تیاریوں میں تھے کہ دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی آغوشِ رحمت میں لے لے اور انہیں شہیدوں کا درجہ عطا کرے۔ آمین۔

انہیں سیاحتِ دیں لے گئی شہادت تک

آج جب کہ اس ملک کی فضاؤں میں لادینیت کی گھٹائیں امڈی ہوئی ہیں اور اہلِ جاہ کی حاکمانہ جبریت اور اہلِ جرم کی تخریب کاریاں زوروں پر ہیں: نفاذِ شریعت کا محاذ ایک اعلیٰ جرنیل کی خدمات سے محروم ہو گیا۔

یہ تھے مفتی سیاح الدین کاکاخیل رحمہ اللہ تعالیٰ۔

خاندانی تعلق صوبہ سرحد کے بزرگ حضرت رحمکار کاکاخیل سے تھا۔ اس خاندان کا مرکزی مقام قصبہ زیارت کاکا صاحب (نوشہرہ) کے قریب ہے۔ مفتی صاحب کے والد حکیم حافظ محمد سعد گل رحمہ اللہ تعالیٰ بھی جید عالم، حافظ قرآن اور ماہر طبیب تھے۔ مفتی صاحب کے نانا حکیم محمد مظہر صاحب بھی عالم دین اور طبیب تھے۔ والدہ ماجدہ نہایت ذہین و فطین بھی تھیں اور عبادت گذار بھی!

ایسی خاندانی فضا اور ایسے والدین کی تربیت کے فیضان سے وہ مبارک شخصیت نمودار ہوئی جس کی جدائی کا لمحہ اذیت درپیش ہے۔

مفتی صاحب کی عمر بھر کی داستانِ سیاحت بڑی جذبہ پرور ہے۔ پیدائش ۸ اگست ۱۹۱۶ء، ابتدائی تعلیم: مارچ ۱۹۳۰ء۔ درسِ نظامی (گھر پر) جنوری ۱۹۳۴ء۔ دیوبند سے فراغت: اکتوبر ۱۹۳۷ء، تدریس و تبلیغ (لشکر درہ) ۱۹۳۸ء۔ تدریس و افتاد (بجبیرہ) ۸ جنوری ۱۹۴۲ء۔ تدریس دیوبند ۱۹۴۳ء۔ تدریس (بحیثیت صدر مدرس) اشاعت العلوم فیصل آباد ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۶ء۔ افتتاح جمعیت اتحاد العلماء دسمبر ۱۹۶۳ء۔ قومی اسمبلی کے انتخاب میں شرکت ۱۹۷۰ء۔ تحریکِ ختمِ نبوت میں حصہ: ۱۹۷۴ء۔

تحریکِ نظامِ مصطفیٰ کے تحت لانگ مارچ (برائے راولپنڈی) میں شمولیت۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے لیے نامزدگی: یکم ستمبر ۱۹۷۷ء۔ یوکے اسلامک مشن کی دعوت پر انگلستان کا دورہ: ۱۹۸۳ء۔ رابطہ مدارسِ اسلامیہ کی تشکیل اور مفتی صاحب کا انتخاب بحیثیت صدر ۱۹۸۳ء۔ انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے تحت مشیر برائے اقتصادیاتِ اسلامی کی حیثیت سے تقرر۔

حج کی سعادت چار مرتبہ نصیب ہوئی (۱) جولائی ۱۹۵۶ء، (۲) ۱۹۷۳ء، (۳) دسمبر ۱۹۷۶ء، (۴) اگست ۱۹۸۳ء۔

۲۳ اپریل ۱۹۸۷ء کو جدہ میں ہونے والی ایک کانفرنس کے لیے جا رہے تھے اور پشاور سے بذریعہ کار روانہ ہوتے ہی حسن ابدال کے پاس حادثہ میں جان جانِ آفرین کو سپرد کر دی۔ آپ کے واحد قابل فرزند بھی ساتھ ہی شہادت پاگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

مرحوم بزرگ کا یہ کارنامہ دنیا میں یاد رہے گا۔ اور آخرت میں ثمرۂ عظیم کا باعث کہ آپ نے اسلامی نظریاتی کونسل کے کام میں بھرپور حصہ لیا اور رفقائے ادارہ کے تعاون سے نافذشدہ غیر اسلامی قوانین کے بیشتر حصے کے خلافِ شریعت پہلوؤں کی نشان دہی کی اور ان کے مسودات صحیح صورت میں مدون کر دیے۔ آج اگر حکمران قوت چاہے تو قوانین کے سارے ڈھانچے کو بدلنے کے لیے پورا مواد تیار رکھا ہے۔

مفتی صاحب نہ صرف دینی علوم کے ماہر تھے، بلکہ جدید ذہن کے اشکالات کو بھی سمجھتے تھے اور جدید دور کے مسائل سے بھی آگاہ تھے۔ اساسی روایات اور معاملاتِ اجماع کے تحفظ کے ساتھ اجتہادی طرزِ فکر سے کام لیتے تھے۔ خاص خوبی یہ تھی کہ دین میں طرح طرح کے نکتے چھانٹنے والے جوشیلے مخالفین اور فرقہ وارانہ بحثیں اٹھانے والوں کو بہت دھیمے دھیمے انداز میں اور بہت اختصار سے سوچنے کے صحیح رُخ پر متوجہ کر دیتے، بلکہ بسا اوقات مخالف کے ہاں سے اچھی بات اخذ کر لیتے۔ اپنی اسی خاص صلاحیت کی وجہ سے کئی اہم قانونی و شرعی مسائل پر اسلامی نظریاتی کونسل میں اندرونی طور پر اتحاد ہو جاتا رہا اور ایوانِ صدر اور وزراء اور بیوروکریسی کے اساطین کو بھی مفتی صاحب نے ہموار کر دکھایا یا کسی گوشے سے ہونے والی مخالفت کا زور توڑ دیا۔

اللہ تعالیٰ جدا ہونے والی روح کو اپنی خاص رحمتوں سے نوازے، ان کے صاحبزادے کی

بھی مغفرت فرمائے۔ ان کے اہلِ خانہ و خاندان کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ علاوہ ازیں دشمنوں میں گھری ہوئی اور بار بار کچلی پِسّتی ملّتِ اسلامیہ پر رحم فرما کر اِسے ویسا ہی کوئی صاحبِ ایمان و علم اور داعیٔ اجتہاد جہاد مردِ کار اور عنایت فرمائے۔ آمین۔

حکمتِ سید مودودیؒ

فیصلہ کن لمحہ

(ادارہ)

یہ وقت جس سے ہم آج گذر رہے ہیں، ہماری اپنی تاریخ کے نازک ترین اوقات میں سے ہے۔ اس وقت ہم ایک دوراہے پر کھڑے ہیں اور ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ ہمارے سامنے جو دو راستے کھلے ہیں، ان میں سے کس کی طرف بڑھیں۔ اس موقع پر جو فیصلہ بحیثیت قوم ہم کریں گے، وہ نہ صرف ہمارے مستقبل پر، بلکہ نہ معلوم کتنی مدت تک ہماری آئندہ نسلوں پر اثر انداز ہوتا رہے گا۔ ہمارے سامنے ایک راستہ تو یہ ہے کہ ہم ان اصولوں پر اپنے نظامِ زندگی کی بنیادیں کھڑی کریں جو اسلام نے ہم کو دیئے ہیں۔ ہماری ساری کی ساری زندگی ——— ہماری معاشرت، ہماری معیشت، ہمارا تمدن، ہماری سیاست، غرض سب کچھ ان اصولوں پر استوار ہو جو اسلام نے مقرر کر دیئے ہیں۔ دوسرا راستہ ہمارے سامنے یہ ہے کہ ہم کسی مغربی قوم کے نظامِ زندگی کو قبول کر لیں، خواہ وہ اشتراکیت ہو، لادینی جمہوریت ہو یا کوئی اور نظامِ زندگی ہو۔

اگر خدانخواستہ ہم نے دوسرے راستے کو پسند کیا تو ہم اپنے اسلام کی بحیثیت قوم نفی کریں گے۔ اور اپنے ان تمام اعلانات سے منحرف ہوں گے جو ایک مدت سے ہم خدا اور خلق دونوں کے سامنے کرتے رہے ہیں۔ اور اس اجتماعی وعدہ خلافی کی وجہ سے خدا و خلق دونوں کے سامنے ہمیں رسوا ہونا پڑے گا۔ پھر اس راستے پر چلنے کا سب سے زیادہ افسوسناک نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان میں اسلام کی تاریخ کا قطعی خاتمہ ہو جائے گا۔ بخلاف اس کے اگر ہم پہلا راستہ انتخاب کریں

اور خالص اسلامی اصولوں پر اپنی قومی زندگی کو قائم کریں تو ہم دنیا میں بھی سرفراز ہوں گے اور آخرت میں بھی ہمارے لیے کامیابی ہوگی۔ ہم خدا کے حضور بھی سُرخرو ہوں گے اور خلق کے سامنے بھی ہمارا وقار قائم ہو سکے گا۔ ہم اسلامی نظامِ زندگی کے علمبردار بن کر پھر اسی مقام پر کھڑے ہو جائیں گے جس پر ہزاروں برس پہلے جب ایک قوم کھڑی ہوئی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اُسے مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ اِنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ یعنی تمھیں دنیا کی ساری اقوام پر فضیلت دی جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد جب اسی مقامِ عظمت پر ایک دوسری قوم کھڑی ہوئی تو اسے کہا گیا۔ "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ" اور "کَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا" یعنی تم بہترین اُمت ہو۔ اور تمھیں مرکزی اُمت بنایا گیا ہے۔

واقعہ درحقیقت یہ ہے کہ صدیوں کے بعد تاریخ میں یہ بات پیش آئی ہے کہ ایک قوم نے کھڑے ہو کر بہ حیثیت قوم کے کہا کہ ہم اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اور چونکہ غیر مسلم اکثریت کی حکومت میں ہمارے لیے اس کا امکان نہیں ہے، لہٰذا ہمیں ایک آزاد خطہ زمین ملنا چاہیے۔ اگر ہمیں یہ آزاد خطہ مل جائے تو اس میں پورے کے پورے اسلام کو غالب کریں گے۔ خدا کے ہاں یہ بات مقبول ہوئی کہ جب یہ قوم کہتی ہے کہ ہم اسلامی نظامِ حیات کو اختیار کرنا چاہتے ہیں تو ایک بار اسے موقع دینا چاہیے۔ ایک مدت سے آپ کو پامال کیا جا رہا تھا، لیکن آپ نے جب یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ پنپنا چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے اس کا موقع فراہم کر دیا۔

یہ موقع جس طرح فضل و رحمت ہے، اسی طرح یہ آزمائش و امتحان بھی ہے۔ پاکستان مل جانے کے بعد آپ سب امتحان گاہ میں کھڑے ہیں۔ اب آپ کا اس امر میں امتحان ہے کہ آپ پچھلے دس سال میں جو کچھ زبانوں سے کہتے رہے ہیں، کیا فی الواقع آپ کے دلوں میں بھی وہی ہے؟ جن باتوں کا آپ اعلان کرتے رہے ہیں، کیا آپ کی نیتیں بھی انھیں کے مطابق ہیں؟ خدا و خلق کے روبرو جو اقرار آپ نے کیے ہیں کیا وہ سچے اقرار تھے یا جھوٹے؟ اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کا جو چرچا آپ نے کیا تھا، کیا وہ لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے تھا یا اب صدق دل سے آپ اپنی زبان سے نکالی ہوئی بات پر عمل کر کے دکھاتے ہیں؟ آپ کہتے تھے کہ پاکستان کا مطلب کیا ہے؟ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ آپ کہتے تھے کہ ہم پاکستان اس لیے چاہتے ہیں کہ اسلام پر پوری طرح عمل کر سکیں۔ اب اللہ تعالیٰ نے پاکستان دے کر آپ کو آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ اور وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ آپ سچے ہیں یا جھوٹے؟

ہم تحریک اسلامی کے کارکن کیسے بنیں؟

سید جلال الدین عمری - انڈیا

آیئے اس سوال پر غور کرنے سے پہلے اسی سے متعلق ایک اور سوال پر غور کر لیں - وہ یہ کہ کیا اسلام ایک تحریک ہے؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہو تو اُوپر کا سوال بامعنی ہوگا، ورنہ اس کے کوئی معنی نہیں ہوں گے۔ اسلام کو جب ایک تحریک کہا جاتا ہے تو اس کی مخالفت دَورِ جدید کے علمبرداروں کی طرف سے بھی ہوتی ہے اور بعض مذاہب کے حاملین کی طرف سے بھی - دَورِ جدید اسلام کو ایک مذہب سمجھتا ہے اور مذہب کے بارے میں ان کا تصور یہ ہے کہ یہ پوجا پاٹ اور کچھ روایات اور مراسم کا مجموعہ ہے۔ جو لوگ اسے مانتے ہیں اس پر عمل کر سکتے ہیں لیکن زندگی کے اور معاملات سے نہ تو اس کا کوئی تعلق ہے اور نہ ہونا چاہیے - آج پوری دُنیا کا اجتماعی اور سیاسی نظام اسی تصور پر مبنی ہے کہ مذہب فرد کا ذاتی معاملہ ہے - اجتماعی زندگی اس سے الگ رہے گی - مذہب کے بارے میں اس رویہ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کہا جاتا ہے کہ اگر مذہب دُنیا کے اجتماعی اُمور و معاملات سے متعلق ہوگا تو دُنیا فتنہ و فساد کی آماجگاہ بن جائے گی - لیکن تعجب ہے یہ بات وہ لوگ کہتے ہیں، جنہوں نے خود دُنیا کو فتنہ و فساد سے بھر رکھا ہے - اس وقت دُنیا میں جو بگاڑ ہے وہ مذہب کا پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ خدا بےزاری اور مذہب دشمنی کے یہ کڑوے کسیلے پھل ہیں جو انسان کو چکھنے پڑ رہے ہیں، بلکہ انہیں سے وہ پیٹ بھرنے پر مجبور ہے۔

یہ تو ہے مذہب کے بارے میں دَورِ جدید کا نقطۂ نظر۔ اس کے سامنے بعض مذاہب اور ان کے حاملین نے بھی یہ تصور دینے کی کوشش کی کہ مذہب اصلاً رُوح کے تزکیہ اور طہارت کے لیے ہے۔ یہ مقامِ بلند

اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان دنیا اور اس کے مسائل سے بے تعلق نہ ہو جائے اور نفس اور اس کی خواہشات کو پوری طرح کچل نہ دے۔ اس کے لیے خاص قسم کی ریاضتیں وجود میں آئیں۔ مشقیں اور تجربات ہونے لگے اور روحانی ترقی کے چاہنے والے دنیا کو چھوڑ کر پہاڑوں، غاروں اور جنگلوں میں چلے گئے۔ اس سے رہبانیت کا ایک پورا نظام وجود میں آیا۔ یہ نظام دور جدید کے تصور ریاست کو تقویت پہنچاتا رہا۔ اس لیے اسے پھلنے پھولنے کے مواقع بھی فراہم ہوتے رہے۔ اس طرح عملاً ایک نے ایک جذبہ سے اور دوسرے نے دوسرے جذبہ سے مذہب کو انسان کی اجتماعی زندگی سے بے دخل کر دیا۔ اسلام کو جو ہم تحریک کہتے ہیں تو ان دونوں نظریات کی تردید کرتے ہیں اور انہیں غلط اور باطل قرار دیتے ہیں۔

تحریک نام ہے کسی مقصد کے لیے حرکت اور جدوجہد کا۔ یہ مقصد جس نوعیت کا ہوگا اسی نوعیت کی جدوجہد ہوگی۔ اسے بعض مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس وقت پورے سماج میں بے ایمانی اور رشوت پھیلی ہوئی ہے۔ فرض کیجیے آپ اس کے خلاف کوئی اصلاحی تحریک چلانا چاہتے ہیں تو اس کا ایک خاص میدان ہوگا یا تعلیم کو عام کرنے کی تحریک آپ کے پیش نظر ہو تو یہ کام خاص حدود میں ہوگا۔ یا کوئی سیاسی تحریک چلانا چاہیں تو اس کا بھی ایک دائرہ ہوگا۔ لیکن اسلام انسان کو پوری طرح بدل دینے کا نام ہے اس کی شخصی زندگی کو بھی اور اجتماعی زندگی کو بھی۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی تحریک ہے جو انسان کو نفس اور خواہش کی غلامی سے، قوم اور قبیلے کی غلامی سے، رسم و رواج کی غلامی سے، غرض یہ کہ ہر چھوٹی بڑی غلامی سے نجات دلا کر ایک خدا کا بندہ اور غلام اور اس کے احکام کا پابند بنانا چاہتی ہے۔ اس تحریک کا ہدف اور گول (GOAL) ہے۔

أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ - (النحل-۳۶)

اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو۔

وہ اس اعلان کے ساتھ آتی ہے کہ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ (اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے)، اس کا مطالبہ ہے۔ اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً (اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ)، وہ کامیابی کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو ضروری قرار دیتا ہے۔ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو

اللہ کے رسول کی اُمید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا)۔ اس نظریہ کی بنیاد پر عرب کی سرزمین میں آج سے چودہ سو سال پہلے جو تحریک اُٹھی اُس نے پورے معاشرے میں ایک ہل چل پیدا کر دی، اس نے مُردوں کو زندہ کیا، سوتوں کو جگایا، کمزوروں کو توانائی عطا کی۔ اپاہجوں کو چلنا سکھایا۔ اور جو لوگ اپنے نفس کے بندے تھے، ان کو خدا کا بندہ بنایا، جو خواہشات کے پیچھے چل رہے تھے ان کو حدود و قیود میں رہنا سکھایا۔ اس سے ایک ایسی اُمت وجود میں آئی جو اس انقلابی فکر کو لے اطرافِ عالم میں پھیل گئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے دُنیا کے ایک بڑے حصہ پر اس نے اسلام کا پرچم گاڑ دیا۔

اسلام نے انسانی زندگی کو جن حدود کا پابند بنایا، اُن کا جب ذکر کیا جاتا ہے تو وہ موجودہ دَور کے سامنے سترھویں اور اٹھارھویں صدی کی مذہبی بندشیں آجاتی ہیں۔ جن کی وجہ سے ذہن و فکر پر تالے لگاتے اور سائنسی اور تمدنی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کی گئی اور اس کے لیے بدترین قسم کی تشدد آمیز کارروائیاں کی گئیں۔ یہ سب کچھ مسیحیت کے نام پر اس کے غلط ترجمانوں نے کیا۔ اس قابلِ مذمت کارروائی کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس نے عقل و دانش کے استعمال پر کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی۔ بلکہ نئی تحقیقات کی راہ کھولی اور تمدن کو آگے بڑھایا۔ وہ تو انسان کے نفس اور خواہشات پر پابندی لگاتا ہے۔ اوہام و خرافات اور بے بنیاد تصورات سے نجات دلاتا ہے، غلط رسوم و رواج اور بے جا بندشوں سے محفوظ رکھتا ہے، اس کی پابندیاں ترقی کی ضامن ہیں نہ کہ اس کی راہ میں رکاوٹ۔

تحریکِ اسلامی، مذہب کے جامد تصور کے خلاف اسلام کا جو حرکی تصور پیش کرتی ہے یہ اس کا ایک ہلکا سا تعارف ہے۔ اب آیئے یہ دیکھیں کہ آدمی اس تحریک کا کارکن کیسے بنتا ہے، لیکن یہاں ایک بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ہر اس شخص کو کسی تحریک کا کارکن کہا جا سکتا ہے جو اس کے لیے وقت دے، تھوڑی سی دوڑ دھوپ کرے اور اس کے بعض کاموں میں تعاون کرے، لیکن اس وقت میرے سامنے مثالی اور معیاری کارکن کا تصور ہے۔ مثالی کارکن وہ ہے جو اپنی پوری زندگی تحریک کے حوالے کر دے، اسی کے لیے سوچے، اسی کے لیے تگ و دو کرے، اسی کی فکر میں تڑپتا رہے، اور تحریک کے مفاد کے لیے اپنے ہر مفاد کو قربان کر دے۔ اس کی جان، مال، قوت و صلاحیت سب کچھ تحریک کے لیے وقف ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ اس کے لیے کارکن کی اصطلاح کو ہلکی سمجھیں اور کوئی اعلیٰ

اصطلاح تجویز کریں، لیکن میرے خیال میں تحریک کی بڑی سے بڑی خدمت انجام دینے والا بھی اس کا کارکن ہی ہوتا ہے۔

تحریک کے ہر کارکن کو مثالی کارکن بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے اندر یہ تمنا، یہ جذبہ اور یہ تڑپ ہونی چاہیے کہ وہ تحریک کا ایک عام کارکن نہیں بلکہ مثالی کارکن بن کر رہے گا۔ اور تحریک کی بڑی سے بڑی خدمت انجام دے گا۔

اس تحریک کا معیاری اور مثالی کارکن بننے کے لیے آدمی کو زبردست تیاری کرنی ہوگی اور اپنے اندر خاص خوبیاں پیدا کرنی ہوں گی، یہاں ان ہی کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

۱۔ جو شخص تحریکِ اسلامی کا معیاری کارکن بننا چاہتا ہو، اس کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اسلام کا گہرا علم حاصل کرے، اسے اچھی طرح سمجھے، اس کے احکام و مقاصد سے باخبر ہو، اس کی رُوح اور مزاج کو اپنے اندر جذب کرے۔ اور یہ علم اور واقفیت اتنی بڑھ جائے کہ اسے اسلام کی حقانیت پر کامل شرحِ صدر حاصل ہو جائے۔ اس کے اندر سے یہ یقین اُبل رہا ہو کہ صرف اسلام ہی کے دامن میں نجات مل سکتی ہے۔ وہ دن کی روشنی میں دیکھ رہا ہو کہ دُنیا باطل نظریات کی آگ میں جل رہی ہے اور غلط اخلاق و اعمال نے اس کو موت کے دہانے تک پہنچا دیا ہے۔ دُنیا کا کوئی نظریہ اس کے اس یقین کو متزلزل نہ کر سکے کہ اس کے پاس نورِ حق ہے اور ظلمت کی ماری ہوئی دُنیا کو وہ راہِ حق دکھا سکتا ہے۔ خدا کے پیغمبر جنہوں نے کفر و ظلمت سے دُنیا کو پاک کیا انہیں اللہ کے دین پر اسی طرح شرحِ صدر ہوتا تھا، اسی طرح شرحِ صدر کے بعد وہ اس پوزیشن میں ہوتے تھے کہ اس بھاری بوجھ کو اُٹھا سکیں جو پہاڑ پر رکھ دیا جائے تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائے اور زمین پر ڈال دیا جائے تو اس کا سینہ شق ہو جائے۔ قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہا گیا کہ تبلیغِ دین کی بھاری ذمہ داری نے آپ کی کمر توڑ رکھی تھی لیکن، اللہ تعالیٰ نے آپ کو شرحِ صدر کی دولت عطا فرمائی جس کی وجہ سے اس راہ پر استقامت اور اس کے لیے دشواریوں کا برداشت کرنا آپ کے لیے آسان ہو گیا۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ	کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لیے کھول
وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِي	نہیں دیا اور تم پر سے وہ بھاری بوجھ نہیں اُتار
اَنْقَضَ ظَهْرَكَ وَرَفَعْنَا لَكَ	دیا، جو تمہاری کمر توڑے ڈال رہا تھا۔ اور تمہارا

وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ (الم نشرح ۔ ۴) خاطر تمہارے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا۔

یہ اللہ کا فضل ہے کہ ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جس میں اسلام کا نام لینے میں بعض وہ رکاوٹیں نہیں ہیں جو کسی زمانے میں تھیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی اللہ کا فضل ہے کہ اسلامی تحریکیں دنیا کے گوشے گوشے میں اسلام کی وکالت اور ترجمانی کا فرض انجام دے رہی ہیں۔ ان تحریکوں نے بہترین اسلوب میں دین کی تفہیم کی خدمت انجام دی ہے اور دے رہی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ بہت سے لوگوں نے ان تحریکوں کے نقطۂ نظر، ان کی زبان اور ان کی اصطلاحات کو تو اپنا لیا ہے لیکن ان کی معنویت اور تقاضوں کو وہ پوری طرح اپنے دل و دماغ میں نہیں اُتار سکے ہیں۔ ان تحریکوں کے زیر اثر یہ کہنا آسان ہے کہ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے، لیکن اس اجمال کو کھولنا آسان نہیں ہے۔ ان تحریکوں نے اس حقیقت کا بےباکانہ اظہار کیا کہ انسان کی سیرت کی تعمیر، معاشرہ کی تشکیل اور ریاست کی تنظیم صحیح خطوط پر اسلام ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے اس لیے اسی کو زندگی کے ہر پہلو پر حکمرانی کا حق حاصل ہے۔ آپ کو ایسے لوگ ملیں گے جو ان تحریکوں سے تعلق کی بنا پر اس انقلابی فکر کا چرچا تو کرتے ہیں لیکن اس کے مضمرات اور پیچیدگیوں سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ ان تحریکوں نے بتایا کہ اسلام، عقیدہ، اخلاق، معاشرت، معیشت اور سیاست کے لیے بہترین اصول فراہم کرتا ہے اور دین و دنیا کے سارے مسائل بہت ہی عمدگی سے حل کرتا ہے، اس لیے دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ زندگی کے تمام شعبے اسی کے تابع ہوں اور اقتدار و حکومت صرف اسی کی تسلیم کی جائے لیکن ایسے لوگ کم ملیں گے جو اس فکر سے اتفاق کے باوجود زندگی کے کسی ایک شعبہ میں اسلام کی برتری ثابت کر سکیں۔

اس میں شک نہیں کہ تحریک میں عوام بھی ہوتے ہیں اور خواص بھی۔ اسلامی تحریک کے ہر فرد سے اس فکری بلندی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ خواص کا مقام قیادت اور رہنمائی کا ہے۔ عوام پیچھے چلتے ہیں علم کے بغیر قیادت کا نازک منصب حاصل نہیں ہو سکتا۔ نعرے اور دعوے عوام کے لیے ہوتے ہیں۔ علم والے دنیا کو ان کی معنویت سمجھاتے ہیں۔ تحریک اسلامی کے مثالی کارکن کو علم والوں کی صف میں نظر آنا چاہیے۔ اس کے لیے اسلام کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اس مطالعہ کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ اسلام کا عمومی مطالعہ ہو اور آدمی اس کے بنیادی مسائل اور احکام اور اس کی غرض و غایت سے اس حد تک واقف ہو جائے کہ وہ اس کا اجمالی تعارف کرا سکے۔ تحریک اسلامی کے ہر کارکن کے لیے اس حد تک اسلام کا مطالعہ بے حد ضروری

ہے۔ اس سے غفلت کسی حال میں نہیں ہونی چاہیے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسلام کا خصوصی مطالعہ کیا جائے۔ اس سے میری مراد اونچی قابلیت اور گہری بصیرت پیدا کرنا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام کے تمام پہلوؤں پر اس نوعیت کا مطالعہ خاص طور پر موجودہ دور میں بہت دشوار بلکہ شاید ناممکن ہے۔ البتہ اسلام کے عمومی مطالعہ کے ساتھ اس کے کسی ایک پہلو پر ہمارے مثالی کارکنوں کو برتر علمی معیار کی تیاری کرنی چاہیے تاکہ وہ تفصیل کے ساتھ اسلام کے اس پہلو پر اظہار خیال کر سکیں اور اس کے ایک ایک نکتہ پر دنیا کو مطمئن کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے غیر معمولی محنت کی ضرورت ہے۔ اس وقت میرا خطاب اصلاً ان نوجوانوں سے ہے جو علم کے مختلف میدانوں میں کام کر رہے ہیں ان سے یہ درخواست بے جا نہ ہوگی کہ وہ اس تیاری سے غافل نہ ہوں۔ ایک طالب علم سے علم ہی سے متعلق گفتگو ہو سکتی ہے۔ اگر وہ علم کے میدان میں ناکام رہا تو یہ اس کا اتنا بڑا نقصان ہوگا کہ شاید کسی اور طریقے سے وہ اس کی تلافی نہ کر سکے۔

۲۔ کسی تحریک کا کارکن اس کا ترجمان ہوتا ہے۔ تحریک اسلامی کے کارکن کو بھی اس کا ترجمان ہونا چاہیے۔ یہ ترجمانی اسے عوام اور خواص میں، مسجدوں اور مدرسوں میں، اسکولوں اور کالجوں میں، بازاروں اور پارکوں میں، بڑے اور چھوٹے مجمعوں میں غرض ہر مقام پر اور ہر جگہ کرنی ہوگی اور اپنی بات چیت سے، تقریر و تحریر سے، صحافت سے، مذاکروں اور مباحثوں سے یعنی ہر اس ذریعہ سے کرنی ہوگی جو اس کے اختیار میں ہو اور جو اس تحریک کے مزاج کے مطابقت رکھتا ہو۔ آپ ہر محاذ پر اسلام کے وکیل اور ترجمان بن کر نظر آئیں، دنیا کی ہر بحث کا رُخ اس کی طرف موڑ دیں، ہر چیلنج کا جواب آپ کے پاس موجود ہو اور ہر الجھن کو آپ اس کی روشنی میں حل کر سکتے ہوں۔ یہ ایک طویل عمل ہے جو اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ دنیا اسلام کے زیر نگیں نہ آجائے اور ہر طرف اس کا بول بالا نہ ہونے لگے ۔۔ یہی زبردست مہم آپ کو سر کرنی ہے۔ سوچیے، کیا آپ اس کے لیے تیار ہیں؟

۳۔ تحریکِ اسلامی کا کارکن وہ ہے جس کی پوری زندگی اس تحریک سے ہم آہنگ ہو، وہ جو کچھ اسٹیج پر نظر آتا ہے وہی اپنی نجی زندگی میں نظر آئے۔ اس کے اخلاق، اس کے اعمال، اس کے تعلقات اور اس کے معاملات سب کچھ تحریک سے مطابقت رکھتے ہوں۔ جس شخص کے اندر یہ خوبی نہ ہو وہ اس کی خدمت تو کیا کرے گا، اس کی بدنامی اور رسوائی کا باعث ہوگا۔ قول و فعل کا تضاد ہر تحریک کو نقصان پہنچاتا ہے ۔۔ اسلامی تحریک کے لیے بھی یہ سم قاتل ہے۔ تحریکِ اسلامی سے وابستہ کسی نوجوان کے لیے اس بات کی بڑی

اہمیت ہے کہ اس کا کردار اس تحریک کے عین مطابق ہو۔ آج کے دور میں جب کہ ہمارے اس ملک کے بلکہ دنیا بھر کے نوجوان ذہنی انتشار کا شکار ہیں۔ ان کی سیرت اور اخلاق کو گھن لگ چکا ہے، وہ بے شمار غلط کاریوں میں مبتلا ہیں، اُن کی وجہ سے ہنگامے ہیں، توڑ پھوڑ ہے، بداخلاقی کے مظاہرے ہیں، زنا و بدکاری ہے۔ ان کے درمیان سے بڑوں کا ادب ختم ہو چکا ہے۔ تعلیم سے ان کی دلچسپی باقی نہیں رہی، ان کے اوقات غلط اور بے مقصد کاموں میں صرف ہو رہے ہیں۔ ان کی وجہ سے ان کے ماں باپ پریشان ہیں، پاس پڑوس اور محلہ کے لوگ پریشان ہیں، اور ملک پریشان ہے۔ اس صورتِ حال میں اگر کوئی نوجوان اسلام کی صحیح تصویر پیش کرے، وہ با اخلاق اور باکردار ہو، بڑوں کا ادب کرنے والا ہو، چھوٹوں کو اس سے تکلیف نہ پہنچے، اس رویہ سے ماں باپ، خویش و اقارب اور ملنے جلنے والے سب خوش ہوں تو اس کی بے زبانی بھی زبان بن جائے گی۔ اور اس کی خاموشی میں گویائی کی طاقت ہوگی۔ وہ اسٹیج پر گئے بغیر بھی اسٹیج پر رہے گا۔ اس کی باتیں کانوں کے پردوں سے ٹکرا کر نہیں لوٹ آئیں گی۔ بلکہ دلوں اور دماغوں کی گہرائیوں میں اُتر جائیں گی۔ اس کا وجود خود اس بات کی دلیل بن جائے گا کہ وہ حق پر ہے اور حق کی طرف دنیا کو بُلا رہا ہے۔ سوچیے کیا کوئی کارکن اتنے بڑے ہتھیار سے محروم ہو سکتا ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اور ایک نوجوان تو ان صلاحیتوں سے مالا مال ہوتا ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہ انمول اور بیش بہا قوتوں اور صلاحیتوں کا ایک خزانہ لیے پھرتا ہے۔ ان سے وہ تخریبی کام بھی کر سکتا ہے اور تعمیری خدمات بھی انجام دے سکتا ہے۔ آپ تحریک اسلامی کے کارکن ہیں۔ آپ کے پاس قوتوں اور صلاحیتوں کا جو خزانہ ہے اُسے اسی تحریک کی خدمت میں لگائیے۔ آپ جانتے ہیں کہ آپ کی یہ صلاحیتیں اور توانائیاں خود بخود آپ کو نہیں مل گئی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں۔ ان کے بارے میں قیامت کے روز سوال ہوگا۔ آپ کے پاس علم ہے تو اس علم کے بارے میں سوال ہوگا۔ آپ کو جوانی ملی ہے تو اس جوانی کے بارے میں سوال ہوگا۔ حدیث میں آتا ہے۔

لن تزول قدما ابن آدم	قیامت کے روز انسان کے قدم ہٹ نہیں
حتیٰ یسئل عن خمس عن عمرہ	سکتے جب تک کہ اس سے پانچ سوال نہ ہو جائیں
فیما افناہ وعن شبابہ فیما	اور وہ ان کا جواب نہ دے دے، اس سے
ابلاہ وعن علمہ ماذا عمل	اپنی ساری عمر کیسے گذاری، اپنی جوانی کس طرح

بما علمہ وعن مالہ من این اکتسبہ وفیما انفقہ (رواہ الترمذی)

ختم کی ۔جو علم حاصل کیا اس کے مطابق کس حد تک عمل کیا ، اپنا مال کہاں سے حاصل کیا اور اسے کہاں خرچ کیا ؟

آپ کو جو صلاحیتیں ملی ہیں اس تحریک کو ان کی سب سے زیادہ ضرورت ہے ۔ وہ بغور دیکھ رہی ہے کہ آپ کی یہ صلاحیتیں اس کے کام آ رہی ہیں یا نہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ دنیا کے بازار میں آپ کی ان صلاحیتوں کی زیادہ قیمت ملے اور تحریک ان کی کوئی قیمت نہ ادا کر سکے ، لیکن محض اس وجہ سے کہ بازار میں ان کی قیمت زیادہ ہے آپ ان کو نیلام نہ چڑھائیے ۔ یہ دنیا اور متاعِ دنیا بے حقیقت ہے اور آپ کی صلاحیتیں یقین مانیے اتنی قیمتی ہیں کہ وہ یہاں کے خزف ریزوں کے عوض نہیں بیچی جا سکتیں ۔ یہ یہاں کے لعل و جواہر سے بھی تولی نہیں جا سکتیں ۔ ان کی قیمت کا تو آج آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتے ۔ اس کی صحیح قیمت اس وقت معلوم ہوگی جب کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا صلہ ملے گا ۔ آپ اتنا پائیں گے کہ اس دنیا کی ہر محرومی کا احساس ختم ہو جائے گا ۔ اور ہر تمنا پوری ہو جائے گی ۔

یہ تحریک کس کی ہے ؟ یہ آپ ہی کی ہے ۔ آپ اس کے دست و بازو ہیں ، آپ مستقبل کے قائد ہیں جن پر اس کے چلانے کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے ۔ آپ وہ ہیں جن کے حوالہ آئندہ یہ امانت کر دی جائے گی ذرا سوچیے کتنی بڑی ذمہ داری آپ پر آنے والی ہے ۔ یاد رکھیے ! دنیا کا مستقبل اس تحریک سے وابستہ ہے ۔ یہ تحریک ہر طرف چھا جانے کے لیے اٹھی ہے اور اللہ نے چاہا تو چھا کر رہے گی ۔ دعا ہے کہ اس کا علَم ہمارے ہاتھوں میں ہو اور ہمارے ذریعہ یہ کارنامہ انجام پا سکے ۔

(یہ مقالہ S.I.O کی کل ہند کانفرنس منعقدہ بنگلور میں اس کے ارکان کی نشست میں ۲۷ دسمبر ۱۹۸۶ء کو پڑھا گیا ۔ اب کسی قدر نظر ثانی کے بعد اسے یہاں پیش کیا جا رہا ہے)

اسلام میں اختلاف کے آداب

(۳)

اہلِ اجتہاد صحابہ کرام

ترجمہ و تلخیص: جناب عبد الحی ابڑو صاحب - اسلامی یونیورسٹی - اسلام آباد

اجتہاد کی اہمیت اور نزاکت اور اس پر مرتب ہونے والے اثرات کے پیش نظر اس جولان گاہ میں وہی صحابہ کرام اترتے جو اس کی صلاحیت و قدرت سے بہرہ ور تھے۔ اس لیے جب ایسی صلاحیت نہ رکھنے والا کوئی شخص اجتہاد کر کے غلطی کر بیٹھتا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ناپسندیدگی کا اظہار فرماتے اور اس کی منظوری نہ دیتے۔

ابو داؤد اور دارقطنی نے حضرت جابرؓ سے روایت کی۔ وہ فرماتے ہیں:

"ہم ایک مرتبہ سفر پر تھے کہ ہمارے ایک ساتھی کے سر پہ پتھر آلگا اور اسے احتلام بھی ہوگیا تھا، اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ کیا میں تیمم کر سکتا ہوں؟ جواب میں انہوں نے اسے بتایا کہ آپ چونکہ پانی استعمال کرنے پر قادر ہیں، لہٰذا تیمم کرنے کی اجازت نہیں، چنانچہ اس نے غسل کیا جس سے اس کی موت واقع ہوگئی۔ ہم جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور واپس پہنچے اور انہیں اس واقعہ کے متعلق خبر دی تو آپؐ نے فرمایا" انہوں نے اسے مار ڈالا - خدا انہیں ہلاک کرے۔ جب انہیں مسئلے کا پتہ نہیں تھا تو کسی (اہل علم) سے کیوں نہیں پوچھا۔ اس لیے کہ بے علم شخص کا علاج پوچھنا

ہی ہے۔ اس کے لیے تیمم کر لینا کافی تھا۔ وہ اپنے زخم پر پٹی باندھ کر اس پر مسح کر لیتا، اور باقی بدن کو دھو لیتا ......" [1]

یہاں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتویٰ دینے والے اصحاب کے عذر کو قابل قبول نہیں سمجھا بلکہ ان سے سختی سے پیش آئے اور بلا علم فتویٰ دینے کی مذمت کی اور انہیں اپنے بھائی کا قاتل ٹھہرایا۔ اور وضاحت سے فرمایا کہ جہالت و لاعلمی کی صورت میں انسان کو اہلِ علم سے پوچھنا چاہیے لاعلمی کی صورت میں فتویٰ میں جلد بازی سے گریز کرنا چاہیے۔ اس بات کی طرف قرآن کریم نے بھی اشارہ کیا ہے:

فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النحل: ۴۳)

"اہلِ ذکر سے پوچھ لو اگر تم خود نہیں جانتے۔"

امام احمد، بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی اور طبرانی نے اسامہ بن زید سے ایک روایت بیان کی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سریہ (جنگ) میں بھیجا جب ہم بنو جُہَینَہ کے علاقہ "حرقات" میں پہنچے تو صبح کا وقت تھا۔ میں نے وہاں پر موجود ایک آدمی کو پکڑ کر گرا لیا۔ تو اس نے کلمہ طیبہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھا، مگر میں نے اس کے باوجود اسے نیزہ مارا جس سے اس کی ہلاکت ہو گئی، میرے دل میں اس کے متعلق خلش سی پیدا ہوئی۔ جس کا ذکر میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ آپ نے فرمایا "کیا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھنے کے باوجود تم نے اُسے قتل کر ڈالا؟" میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس نے محض ڈر کے مارے کلمہ پڑھا تھا۔ آپ نے فرمایا "کیا تم نے اس کا دل چیر کر یہ معلوم کر لیا تھا کہ اس نے محض ڈر کے مارے ایسا کہا ہے؟ قیامت کے دن اس کے کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ سے تمہیں کون چھڑائے گا؟ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بار بار یہ بات دہراتے رہے۔ یہاں تک کہ میرے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ کاش میں آج سے پہلے

[1] سنن ابی داؤد "باب المجدور تیمم" حدیث نمبر ۳۳۶ - ابن ماجہ حدیث نمبر ۵۷۲، اور دیکھیے نیل الاوطار: ۱/۳۲۳ -

مسلمان نہ ہوا ہوتا۔[۱] اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ ایسی صورت میں انہیں آج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی سے دوچار نہ ہونا پڑتا۔

پہلی حدیث میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے اس استدلال کو درست قرار نہیں دیا جس کے مطابق انہوں نے عام دلائل کی روشنی میں پانی کی موجودگی کی صورت میں اس کے استعمال کو ضروری قرار دیا۔ چاہے پانی استعمال کرنے والے شخص کے حالات کچھ بھی ہوں۔ ان کا ذہن اس آیت کی طرف متوجہ نہ ہو سکا

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا۔

(المائدہ ۵-۶)

"اگر تم بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے یا تم نے اپنی عورتوں سے مباشرت کی ہو۔ اور پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کر لو"

پھر انہوں نے کسی اہل علم سے سوال بھی نہیں کیا، درآنحالیکہ وہ اہل اجتہاد بھی نہ تھے۔

رہی حدیث اسامہ رضی اللہ عنہ، تو شاید انہوں نے آیت کریمہ (...... فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا......" (المومن: ۸۵) مگر ہمارا عذاب دیکھ لینے کے بعد ان کا ایمان ان کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو سکتا تھا) سے یہ مفہوم نکالا ہو کہ موت کو سامنے دیکھ کر ایمان قبول کرنا جس طرح آخرت میں کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا اسی طرح دنیا میں بھی سود مند نہیں ہوگا۔ (جیسا کہ آیت کریمہ کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے، جب کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے اور اسی بنا پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سرزنش کی۔)

صحابہ کرامؓ کے فتاویٰ کے یہ چند نمونے ایسے ہیں جن سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتفاق نہیں فرمایا۔[۲]

---

[۱] یہ حدیث مختلف الفاظ کے ساتھ روایت ہوئی ہے، دیکھیے: صحیح البخاری - کتاب المغازی باب بعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم اسامہ بن زیدؓ الی الحرقات۔

[۲] ابن حزم نے ایسے کئی فتاویٰ جمع کیے ہیں جنہیں رسول اکرم نے قبول نہیں کیا، دیکھیں: الاحکام ۶/۸۴-۸۵ اور ۲/۱۲۶-۱۲۷۔

اکثر لوگ آپ سے اپنی روزمرہ زندگی میں پیش آمدہ مسائل و واقعات کے بارے میں استفسار کرتے جن کے متعلق حضورؐ انہیں جواب مرحمت فرماتے۔ نیز ان کے درمیان تنازعات کے فیصلے فرماتے[1] ان کے اچھے کام دیکھ کر پسند فرماتے اور کرنے والے کی تعریف کرتے، خلافِ شرع کام کو ناپسند فرماتے ــــ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان تمام چیزوں کو سیکھتے۔ انہیں آگے بیان کرتے جس سے لوگوں میں ان کا چرچا ہوتا۔ کبھی ان کا آپس میں اختلاف بھی ہو جاتا۔ اور ایسی صورت میں وہ اختلافی مسائل کے بارے میں اپنی آرا پیش کرتے اور اس سے ان کا مطمحِ نظر حق کی تلاش ہوتا، نہ کہ خواہ مخواہ تنازعہ اور اختلاف برائے اختلاف وہ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے اور الزامات کے تبادلے سے بھی گریز کیا کرتے تھے۔ اس لیے کہ کتاب و سنت کو وہ اپنا مرجع مان کر تمام اختلافات کو اس کی روشنی میں حل کر دیتے تھے کوئی ایسی چیز باقی نہ رہنے دیتے جو ان کی اخوت و محبت کو متاثر کرتی۔

اختلاف برائے اختلاف سے پرہیز

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ اس امت کی بقا اس پر موقوف ہے کہ جو دل اللہ کی محبت کی خاطر اکٹھے ہوئے ہیں، ان کی آپس میں اُلفت و محبت قائم و دائم رہے۔ کیونکہ اگر ایک مرتبہ دلوں میں دُوری اور کدورت پیدا ہو گئی تو یہ چیز اُمت کی تباہی و بربادی پر منتج ہو گی۔ اسی لیے آپ صحابہ کرامؓ کو اختلاف برائے اختلاف سے باز رہنے کی تلقین فرماتے۔ اور فرماتے تھے:

"لا تختلفوا فتختلف قلوبکم"[2] یعنی اختلاف برائے اختلاف سے بچو، ورنہ تمہارے دل بھی اختلاف و منافرت کا شکار ہو جائیں گے"۔ صحابہ کرام بھی یہ بات خوب جانتے تھے کہ اختلاف برائے اختلاف کا نتیجہ کبھی بھی بہتر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا نتیجہ ہمیشہ شر ہی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں۔ "الخلاف شر"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اختلاف کی بیخ کنی اس کے پروان چڑھنے سے پہلے ہی فرما دیتے۔

---

[1] دیکھیے حجۃ اللہ البالغہ (شاہ ولی اللہ) ۱/۲۹۸

[2] بخاری - کما فی الجامع الصغیر ۲/۲۹۴

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: میں ایک دن دوپہر کے وقت آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ کو دو اشخاص کی آواز سنائی دی جو ایک دوسرے سے ایک آیت کے بارے میں اختلاف کر رہے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غصے کی حالت میں باہر تشریف لائے اور فرمایا:

"تم سے پہلے کی اُمتیں کتاب اللہ میں اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک و برباد ہوئی تھیں۔"[1]

نزال بن سبرہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا:

"میں نے ایک شخص کو ایک آیت اس طریقے کے خلاف پڑھتے سنا جس طریقے سے میں نے یہ آیت آپؐ سے سنی تھی، میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور حضورؐ کے پاس لے کر آیا تو آپؐ نے فرمایا: "دونوں کی قراءت درست ہے۔" شعبہ (راوی) کہتے ہیں کہ آپؐ نے غالباً یہ بھی فرمایا:

"آپس میں اختلاف سے بچو، کیونکہ سابقہ اُمتیں آپس کے اختلاف کی وجہ سے ہی ہلاک ہوئیں۔"[2]

یہاں آپؐ نے صحابہ کرام کو اور بعد میں آنے والی نسلوں کو اختلاف برائے اختلاف کے نتائج سے آگاہ فرما کر اس سے دُور رہنے کی تلقین کی ہے۔ صحابہ کرامؓ کو آپؐ نے قرآن کریم کی قراءت کے بارے میں اختلاف کے آداب کے متعلق خاص تلقین فرمائی ہے، آپ کا ارشاد گرامی ہے۔

"جب تک تمہارے دل آپس میں ملے رہیں۔ اُس وقت تک قرآن کی تلاوت کرو، اور جب اس میں تمہارے درمیان اختلاف ہو جائے تو اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔"[3]

---

[1] دیکھیے: الاحکام لابن حزم: ۵/۶۶

[2] ایضاً، صحیح البخاری "باب کراہیۃ الاختلاف" ۱۳/۲۸۹ - اور "باب نزل القرآن علی سبعۃ الاحرف" ۶/۲۲ - ۲۶ -

[3] بخاری، مسلم، احمد اور امام نسائی نے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ (الجامع الصغیر ۱/۸۶)

عہدِ نبویؐ میں آدابِ اختلاف کے چند نقوش

عہدِ نبویؐ میں آدابِ اختلاف کے چند واقعات کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ صحابہ کرامؓ کی حتی الوسع یہ کوشش ہوتی تھی کہ اختلاف پیدا نہ ہو۔ اس لیے وہ فرضی مسائل میں اُلجھنے اور جزئیات نکالنے سے بالعموم گریز کیا کرتے تھے[۱] اور صرف پیش آمدہ واقعات کا سنتِ نبوی کی روشنی میں حل بتا دیتے تھے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر پیش آمدہ واقعے کے حل پر اکتفا کیا جائے تو ایسی صورت میں بحث یا جھگڑے کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے، چہ جائیکہ تنازعے اور عناد کی صورتیں پیدا ہوں۔

۲۔ اختلاف سے بچنے کی تمام ممکنہ تدابیر اختیار کرنے کے باوجود اگر اختلاف واقع ہوتا تو مختلف فیہ معاملے کا فوراً کتاب اللہ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی روشنی میں جائزہ لیتے۔ نتیجۃً وہ اختلاف فوراً دور ہو جاتا۔

۳۔ کسی معاملہ میں اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم معلوم ہو جانے کے بعد وہ فوراً سرِ تسلیم خم کر دیتے۔ اس کی پابندی کرنا ان کا شیوہ بن جاتا۔

۴۔ جو امور تاویل کے متحمل ہوتے، ان میں صحابہ کرامؓ کے مابین اختلافِ آرا کی صورت میں حضورؐ اُن کی رہنمائی فرماتے۔ پھر اختلافِ رائے کی صورت میں ہر فریق کو یہ احساس بھی رہتا کہ اس کے دوسرے بھائی کی رائے میں بھی اسی طرح درستگی کا امکان موجود ہے جتنا اس کے اپنے خیال کے مطابق اس کی اپنی رائے میں ہے۔ یہ احساس بذاتِ خود اس بات کا ضامن تھا کہ ایک دوسرے کے احترام پر کوئی آنچ نہ آنے دی جائے۔ اور کسی رائے کے رد یا قبول کے بارے میں بے جا اصرار نہ کیا جائے۔

۵۔ وہ تقوٰی کا دامن پکڑے رہتے اور نفسانی خواہشات سے اجتناب کرتے، چنانچہ اختلاف کرنے والوں کا منتہائے مقصود صرف حقیقت تک رسائی ہی ہوتا۔ قطع نظر اس سے کہ

(باقی بر صفحہ ۵۰)

[۱] دیکھیے فتح الباری ۱۳/۲۱۹ ـ ۲۲۸

روزہ اور اُس کے مقاصد

جناب عبد الرشید عراقی صاحب - سوہدرہ -

اسلام کے چار بنیادی ارکان میں روزہ ایک اہم رکن ہے اور روزہ کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ [1]

"اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے جیسا کہ ان لوگوں پر فرض کیے گئے جو تم سے پہلے تھے، عجب نہیں کہ تم متقی بن جاؤ۔"

یہودیوں کا روزہ یہودی مذہب میں بھی روزہ کا ثبوت ملتا ہے اور اس میں ایک روزہ وہ ہے، جو کفارہ کے طور پر رکھا جاتا ہے اور اس کے علاوہ مسلسل روزہ بھی ہے جن کا تعلق قدیم حوادث اور واقعات سے ہے۔ اور ان روزوں کے علاوہ کچھ روزے اور بھی ہیں جو ان مختلف المناک حوادث کی یاد میں رکھے جاتے ہیں، جو یہودیوں کو پیش آئے۔

روزہ یہودیوں میں اشراق کے وقت شروع ہوتا ہے اور رات کے پہلے تارہ تک جاری رہتا ہے۔ سوائے اس روزہ کے جو کفارہ کے لیے ہے۔ اور مئی کے نویں روز رکھا جاتا ہے۔ یہ روزہ شام سے شام تک چلتا ہے۔ عام روزوں کے لیے کوئی خاص احکام و قوانین نہیں ہیں۔ روزہ میں صدقہ

[1] البقرہ - ۱۸۳

دینے اور مساکین کو کھانا کھلانے کی بھی ترغیب دی گئی ہے۔ خصوصاً رات کے اس کھانے کی غرباء میں تقسیم پر جو معمولاً تیار کیا جاتا ہے، زیادہ زور دیا گیا ہے۔

عیسائیوں کا روزہ عیسائی مذہب میں بھی روزہ کا ثبوت ملتا ہے لیکن اس کی تفصیل اور تشریح کرنا ذرا مشکل ہے۔ روزہ کے طریقہ واحکام میں بھی اختلاف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسیحی شریعت فقہ اور احکام کے لحاظ سے دوسرے مذاہب سے پیچھے ہے۔ عیسائی مؤرخین نے جو یہ لکھا ہے کہ حضرت مسیحؑ نے اپنی نبوت کے آغاز سے قبل ۴۰ دن روزہ رکھا تھا اور یہ کفارہ کا روزہ تھا۔ اس کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا۔ عام طور پر عیسائی راہبوں اور پادریوں کی طرف سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ جنسی ترغیبات کے مقابلہ کے لیے وہ روزہ کی تلقین کرتے تھے۔

ہندو مذہب اور روزہ ہندو مذہب میں بھی روزہ کا ثبوت ملتا ہے۔ مسٹر مہادیوان صدر شعبۂ فلسفہ مدراس یونیورسٹی لکھتے ہیں:

> ان تہواروں میں جن کو سالانہ منایا جاتا ہے، بعض تہوار روزہ (برت) کے لیے مخصوص ہیں جو تزکیہ نفس کے لیے رکھا جاتا ہے۔ ہر ہندو فرقہ نے دعا وعبادت کے لیے کچھ دن مقرر کر لیے ہیں، جن میں اکثر افراد روزہ رکھتے ہیں اور کھانے پینے سے باز رہتے ہیں۔ رات بھر جاگ کر اپنی مذہبی کتابوں کی تلاوت کرتے اور مراقبہ کرتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم اور مشہور تہوار جو مختلف فرقوں میں رائج ہے "ویکنتا ایکادشی" کا تہوار ہے جو وشنو کی طرف منسوب ہے، لیکن اس میں صرف وشنو ہی کے ماننے والے نہیں بلکہ دوسرے بہت سے لوگ بھی روزہ رکھتے ہیں۔ اس تہوار میں دن میں روزہ رکھتے ہیں اور رات کو پوجا کرتے ہیں۔ بعض دن ایسے ہیں جو عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ وہ ان مورتیوں سے دعائیں کرتی ہیں جو ایشور کی ان نسوانی صفات کا مظہر ہیں جو مختلف اشکال میں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان دنوں کو ان کی مخصوص اہمیت کے پیشِ نظر "برت" یا عہد معاہدہ کہا جاتا ہے۔ یہ روح کے تزکیہ کے لیے مخصوص ہیں۔ ان کا مقصد روح کو معنوی غذا پہنچانا ہے۔[1]

[1] آوٹ لائن آف ہندوازم باب ۴۔ سیکشن ۔۶

قدیم مصری دور میں علامہ سید سلیمان ندوی (م ۱۳۷۳ھ) لکھتے ہیں :-

قدیم مصریوں کے ہاں بھی روزہ دیگر مذہبی تہواروں کے شمول میں نظر آتا ہے یونان میں صرف عورتیں "تھیسموفیریا" کی تیسری تاریخ کو روزے رکھتی تھیں۔ پارسی مذہب میں بھی گو عام پیروؤں پر روزہ فرض نہیں، لیکن ان کی الہامی کتاب کی ایک آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ کا حکم ان کے یہاں موجود تھا۔ خصوصاً مذہبی پیشواؤں کے لیے تو پنجسالہ روزہ ضروری تھا۔[1]

عرب میں اہل عرب بھی اسلام سے پہلے سے روزہ سے کچھ نہ کچھ مانوس تھے، مکہ کے قریش جاہلیت کے دنوں میں عاشورا (یعنی دسویں محرم کو) روزہ رکھتے تھے۔ کیونکہ اس دن خانہ کعبہ پر غلاف چڑھایا جاتا تھا۔[2] مدینہ میں یہود اپنا عاشورہ الگ مناتے تھے[3] یعنی وہ اپنے ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ کو روزہ رکھتے تھے۔ ان تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی یہ آیت :-

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔

مسلمانو! تم پر روزہ اس طرح لکھا گیا ہے جس طرح تم سے پہلوں پر لکھا گیا تھا۔

کس قدر تاریخی صداقت پر مبنی ہے۔

روزہ کی حقیقت روزہ کی غرض و غایت تقویٰ ہے۔ اور روزہ کی یہ حقیقت تمام مذاہب میں مشترک ہے۔ قرآن مجید نے اس بات کی تصریح کی کہ مسلمانو! تم پر روزہ لکھا گیا۔ جس طرح تم سے پہلے اُمتوں پر لکھا گیا تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔ اور تقویٰ کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی خواہشات کو قابو میں رکھا جائے اور اپنے آپ کو جذبات کے تلاطم سے بچایا جا سکے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ روزہ ہمارے لیے ایک قسم کے روحانی علاج کے طور پر فرض ہوا ہے۔

---

[1] سیرۃ النبی جلد ۵ ص ۲۱۲

[2] مسند احمد بن حنبل جلد ۶ ص ۲۴۴

[3] صحیح بخاری کتاب الصوم جلد ۱ ص ۵۶۲

علامہ سید سلیمان ندوی (م ۱۳۷۳ھ) لکھتے ہیں:

"تقویٰ" دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس کے حاصل ہونے کے بعد دل کو گناہوں سے جھجک معلوم ہونے لگتی اور نیک باتوں کی طرف اس کو بے تابانہ تڑپ ہوتی ہے۔ اور روزہ کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے اندر یہی کیفیت پیدا ہو۔ بات یہ ہے کہ انسانوں کے دلوں میں گناہوں کے اکثر جذبات بہیمی قوت کی افراط سے پیدا ہوتے ہیں۔ روزہ انسان کے ان جذبات کی شدت کو کمزور کرتا ہے۔[۱]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:۔

اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ — روزہ ڈھال ہے

اور آپؐ نے ایسے نوجوانوں کا علاج جو اپنی مالی مجبوریوں کے سبب نکاح کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ اور ساتھ ہی اپنے نفس پر بھی قابو نہیں رکھتے، روزہ رکھنے کی ترغیب دی ہے اور فرمایا ہے کہ روزہ شہوت کو توڑنے اور کم کرنے کے لیے بہترین چیز ہے۔

علامہ ابن القیم (م ۷۵۱ھ) لکھتے ہیں:

چنانچہ ایسے شخص کو جو نکاح کا خواہشمند ہو اور استطاعت نہ رکھتا ہو اسے روزے رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اور اس کو اس کا تریاق قرار دیا گیا ہے مقصود یہ ہے کہ روزہ کے مصالح اور فوائد چونکہ عقلِ سلیم اور فطرتِ صحیحہ کی رُو سے مسلمہ ہے، اس لیے اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی حفاظت کی خاطر محض اپنی رحمت اور احسان سے فرض کیا ہے۔[۲]

تقویٰ کو تمام عبادات کی اصل قرار دیا گیا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

تمام عبادات میں روزہ کو تقویٰ کی اصل اور بنیاد اس لیے بھی قرار دیا گیا ہے کہ یہ ایک مخفی خاموش عبادت ہے، جو ریا اور نمائش سے بَری ہے۔ جب تک خود

[۱] سیرۃ النبی جلد ۵ ص ۲۳۳،

[۲] زاد المعاد جلد ۱ ص ۱۵۲

انسان اس کا اظہار نہ کرے، دوسروں پر اس کا راز افشا نہیں ہو سکتا۔ اور یہی چیز تمام عبادات کی جڑ اور اخلاق کی بنیاد ہے[1]

روزہ کے مقاصد

اسلام میں روزہ کے مقاصد کیا ہیں۔ اس کے متعلق قرآن مجید میں یہ فرمایا گیا ہے:

لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ[2]

"اب تک خدا نے جو تم کو ہدایت کی ہے اس پر اس کی بڑائی اور عظمت کرو۔"

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ[3]

"تاکہ اس ہدایت کے ملنے پر تم خدا کا شکر کرو"

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ[4]

"تاکہ تم پرہیزگار بنو (یا تم میں تقویٰ پیدا ہو)

روزہ کے مقاصد پر امام غزالی م ۵۰۵ھ، فرماتے ہیں۔

روزہ کا مقصد یہ ہے کہ آدمی اخلاقِ الٰہیہ میں سے ایک اخلاق کا پرتو اپنے اندر پیدا کرے جس کو صمدیت کہتے ہیں۔ وہ امکانی حد تک فرشتوں کی تقلید کرتے ہوئے خواہشات سے دست کش ہو جائے۔ اس لیے کہ فرشتے بھی خواہشات سے پاک ہیں اور انسان کا مرتبہ بھی بہائم سے بلند ہے۔ نیز خواہشات کے مقابلہ کے لیے اس کو عقل و تمیز کی روشنی عطا کی گئی ہے۔ البتہ وہ فرشتوں سے اس لحاظ سے کم تر ہے کہ خواہشات اکثر اس پر غلبہ پا لیتی ہیں۔ اور اس کو ان سے آزاد ہونے کے لیے سخت مجاہدہ کرنا پڑتا ہے چنانچہ جب وہ اپنی خواہشات کی رو میں بہنے لگتا ہے تو اسفل سافلین تک جا پہنچتا ہے۔ اور جانوروں کے ریوڑ سے جاملتا ہے اور جب اپنی خواہشات پر غالب آتا ہے تو اعلیٰ علیین اور فرشتوں کے آفاق تک پہنچ جاتا ہے[5]

---

[1] سیرۃ النبی جلد ۵ ص ۲۳۹ - [2] البقرہ - ۱۸۵ [3] البقرہ - ۱۸۵

[4] البقرہ - ۱۸۳ [5] احیاء العلوم جلد ا ص ۲۱۲

روزہ کے مقاصد پر علامہ ابن القیم (م ۷۵۱ھ) اسی طرح روشنی ڈالتے ہیں:

روزہ سے مقصود یہ ہے کہ نفسِ انسانی خواہشات اور عادتوں کے شکنجہ سے آزاد ہو سکے۔ اس کی شہوانی قوتوں میں اعتدال اور توازن پیدا ہو، اور اس ذریعہ سے وہ سعادتِ ابدی کے گوہر مقصود تک رسائی حاصل کر سکے، اور حیاتِ ابدی کے حصول کے لیے اپنے نفس کا تزکیہ کر سکے۔ بھوک اور پیاس سے اس کے ہوس کی تیزی اور شہوت کی حدت میں تخفیف پیدا ہو۔ اور یہ بات یاد آئے کہ کتنے مسکین ہیں جو نانِ شبینہ کے محتاج ہیں۔ وہ شیطان کے راستوں کو اس پر تنگ کر دے۔ اور اعضاء جوارح کو ان چیزوں کی طرف مائل ہونے سے روک دے، جن میں دنیا و آخرت دونوں کا نقصان ہے۔ اس لحاظ سے یہ اہلِ تقویٰ کی لگام ہے، مجاہدین کی ڈھال اور ابرار و مقربین کی ریاضت ہے [1]

اور روزہ کے اسرار و مقاصد پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے حافظ ابن القیم رح لکھتے ہیں:

روزہ جوارح ظاہری اور قوائے باطنی کی حفاظت میں بڑی تاثیر رکھتا ہے۔ فاسد مادہ کے جمع ہو جانے سے انسان میں جو خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان سے وہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔ جو چیزیں مانع صحت ہیں ان کو خارج کر دیتا ہے۔ اعضاء و جوارح میں جو خرابیاں ہوا و ہوس کے نتیجہ میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ وہ اس سے دفع ہوتی ہیں۔ وہ صحت کے لیے مفید اور تقویٰ کی زندگی اختیار کرنے میں بہت معاون ہے [2]

روزہ میں اسلام کا اصلاحی کردار

اسلام نے جس طرح دوسرے تمام فرائض اور عبادات میں اپنا اصلاحی کردار ادا کیا ہے، اسی طرح روزہ کے مفہوم، آداب و احکام اور اس کی شکل اور طریقہ کار میں بھی اپنا اصلاحی کردار ادا کیا ہے۔

[1] زاد المعاد جلد ۱ ص ۱۵۲

[2] زاد المعاد جلد ۱ ص ۱۵۲

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ تعالیٰ لکھتے ہیں -

شریعتِ اسلامی نے نہ روزہ کو نفس کو ایذا پہنچانے اور تکلیف میں مبتلا کرنے کا ذریعہ بنایا ہے، نہ اس کو خدا کا عذاب قرار دیا ہے - پورے قرآن وحدیث میں ایک لفظ بھی ہم کو ایسا نہیں ملتا جس سے اس کا اشارہ نکلتا ہو، اس نے اس کو ایک ایسی عبادت کے طور پر پیش کیا ہے، جس کا مقصد اللہ کا قرب حاصل کرنا ہے - اس نے اس کے احکام اور قوانین بھی ایسے خشک اور ظالمانہ نہیں بنائے کہ اس کا قطعی نتیجہ نفس کی ایذا رسانی کی شکل میں ظاہر ہوتا - اور اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ پڑ جاتا — بلکہ اس نے سحری کھانا سنت قرار دیا - اور تاخیر کے ساتھ کھانے کو مستحب، اور ہدایت کی کہ فجر کی پو پھٹنے تک کھاتے رہو - افطار میں عجلت کا حکم دیا - رات اور دن دونوں میں سونے اور آرام کرنے کی اجازت دی - کاروباری تجارت اور مفید کاموں میں انہماک و مصروفیت کو بھی یہودی مذہب کے برعکس جائز رکھا - جس میں روزہ کی حالت میں کام کرنا ممنوع ہے اور مکمل طور پر خلوت وعبادت لازمی ہے[1]

پس اس بابرکت مہینے میں اتباعِ احکامِ الٰہی اور احترام رمضان نہایت لازم ہے -

---

[1] ارکانِ اربعہ ص ۳۰۰

مومن کے خصائل

جناب سید اسعد گیلانی صاحب

(۳)

عملی اسلامی تربیت مسلمان کو اللہ تعالیٰ نے صرف الفاظ کے طوطا مینا بنانے کے لیے پیدا نہیں کیا، بلکہ وہ انسانی زندگیوں میں خوشگوار اصلاحی انقلاب برپا کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس کا حقیقی میدان عمل کا میدان ہے۔ وہ انسانی زندگی کی کھیتی میں اپنی اصلاح کے بیج بوتا ہے اور خوشگوار اخلاق و کردار کی فصل اُگاتا ہے۔ اس کے ذریعے انسانیت عملی طور پر فلاح کا راستہ اختیار کرتی ہے۔ وہ کوئی راہب نہیں ہوتا کہ خاموشی سے غار کا یا گوشہ گیری کا راستہ اختیار کرے وہ کوئی جوگی نہیں ہوتا کہ پہاڑ کی کھوہ میں بیٹھ کر شانتی کو تلاش کرتا رہے۔ وہ کوئی "تارک دنیا" نہیں ہوتا کہ جس دنیا میں اس کو امتحان کے لیے اتارا گیا ہے، وہ اس امتحان گاہ سے خاموشی کے ساتھ نکل کر ایک کونے میں جا لگے اور ساری ذمہ داری سے الگ ہو جائے وہ تو حضور اکرمؐ کے اس ارشاد کا مخاطب ہوتا ہے کہ:

"تم میں سے جو کوئی بدی دیکھے تو لازم ہے کہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے اور اگر اس کی استطاعت نہیں رکھتا ہو تو زبان سے ہی اس کی مذمت کرے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو کم از کم دل میں اس کو مٹانے کی خواہش رکھے۔ کیونکہ یہ ایمان کا کم از کم درجہ ہے۔ جس دل میں بدی سے نفرت نہ ہو اس میں رائی برابر بھی ایمان نہیں ہے۔"

اس لیے قرآن میں صاف صاف حکم دیا کہ:

"تم میں سے ایک ایسی جماعت ضرور ہی ہونی چاہیے جو نیکی کی طرف بلائے، اچھے

کام کا حکم دے اور بُرے کام سے روکے اور فلاح پانے والے ایسے ہی لوگ ہیں۔

(القرآن)

یہ ہدایات ایک اچھے مسلمان کو واضح طور پر میدانِ عمل میں آکر کام کرنے کا حکم دیتی ہیں۔

اصلاحِ خلق کی عملی جدوجہد ایک معیاری مسلمان کی تربیت کا پہلا عملی ذریعہ یہ ہے کہ وہ اس کام کو سرانجام دے جس کام کو وہ حق سمجھتا ہے۔ درحقیقت وہ اس وقت تک اپنی دعوت کے فطری نتائج سے دوچار نہیں ہوتا جب تک وہ میدان میں آکر بندگانِ خدا کے سامنے عملی طور پر اسلام کی دعوتِ حق پیش نہ کرے۔ اس اقدام کے ساتھ ہی اُسے تعاون کرنے والے دوستی کے افراد ملیں گے جو اس کے رفیقِ کار رہیں گے اور مزاحمت کرنے والے دستِ عدو سے بھی واسطہ پڑے گا جو اس کا راستہ روکیں گے۔ یوں عملی جدوجہد کے ساتھ ہی اُسے رفاقت کے لطف اور مزاحمت کی اذیت سے دوچار ہونا پڑے گا اور یہی دونوں احوال اس کی تربیت کے لیے کافی ہوں گے۔ دوستوں سے مل کر وہ کام کا نقشہ بنائے گا اور مخالفوں کی مزاحمتوں کے توڑ کی تدابیر سوچے گا۔ اور ان کے مظالم پر صبر کی مشق کرے گا۔ اس طرح اس کے اندر پختہ عزم و ارادہ پرورش پائے گا۔ اور آزمائش کی بھٹی سے گزر کر وہ سونا ہو جائے گا

اس جدوجہد میں اس کے قریبی عزیز اور ہمدرد بھی اس کا راستہ روکیں گے تا کہ وہ اپنے دنیوی مستقبل کو خراب نہ کرے اور اس کے مخالف بھی اس کا راستہ روکیں گے تا کہ وہ ان کے عزائم میں حائل نہ ہو۔ یہ صورتِ حال اس کی تربیت کے لیے ایک اچھا ماحول فراہم کر دے گی، جس میں ڈھل کر وہ ایک کامیاب مصلح اور مبلغ بن جائے گا۔

صحبتِ صالح مسلمان کی تربیت کا دوسرا عملی ذریعہ صحبتِ صالح ہے اسے بُرے لوگوں کی صحبت و رفاقت الفت سے دست کش ہو کر خدا ترس اور نیک لوگوں کی صحبت و ہم نشینی اختیار کر لینی چاہیے تا کہ اس پر باطل کی ہم نشینی کے ناخوشگوار اثرات نہ پڑیں اور اس میں باطل باتوں اور لغو حرکات برداشت کرنے کی عادت نہ پڑے۔ اس میں وہ مداہنت پرورش نہ پائے جس کی موجودگی میں انسان برائی کو برداشت کرتا ہے۔ وہ اپنے ہم خیال اور نیک لوگوں کی مجلس سے خود بھی مستفید ہوگا اور ان کو بھی دینِ حق کی پشت پناہی پر آمادہ کر سکے گا۔ اگر ایک نمازی آدمی بے نمازیوں کی رفاقت اختیار کرلے تو وہ ضرور ہی آہستہ آہستہ نمازوں میں کوتاہی کا شکار ہوتا چلا جائے گا۔ اور اس کے ہم نشین

اس کے لیے نماز کو قائم کرنے میں مددگار ثابت ہونے کے بجائے کوتاہی کرنے کا باعث بنتے چلے جائیں گے۔ اس لیے ایک مسلمان کی اخلاقی تربیت کا ذریعہ نیک لوگوں کی مجلس و رفاقت ہے نہ کہ بُروں کی ہم نشینی۔ جب نیکی ایک جماعت کی صورت اختیار کر کے کام کرتی ہے اسی صورت میں وہ زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ ویسے بھی اسلام نے مسلمانوں کو نیکی کا حکم دینے والوں کی ایک جماعت بنا کر کام کرنے کا حکم دیا ہے۔ جس طرح کوئلوں کے پاس بیٹھنے والے سیاہی سے نہیں بچ سکتے اسی طرح پھولوں کے درمیان بیٹھنے والے اُن کی خوشبو اپنے وجود میں سمیٹ لیتے ہیں۔ اسی طرح انسان پر صحبتِ نیک و بد کا اثر ہوتا ہے۔ نیک لوگوں کے اجتماعات میں شرکت نیکی کرنے کا ذریعہ اور نیکی کی دعوت پھیلانے کا باعث بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ نیک لوگ باہم ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں اس طرح اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ باہمی اصلاح کا عمل بھی جاری رہتا ہے اور یوں ایک ساتھی اگر گرتا نظر آتا ہے تو دوسرا اُسے سنبھالتا ہے۔ اور ایک کے پائے استقامت میں اگر لغزش آتی ہے تو دوسرا آگے بڑھ کر اُسے تھام لیتا ہے۔ ایک کے دامن کا دھبہ دوسرا صاف کر دیتا ہے۔ اور اگر دوسرے کا دامن آلودہ ہو رہا ہو تو پہلا اُسے پاک کر دیتا ہے۔ ایک کی فلاح دوسرے کی رہنمائی کا باعث بنتی ہے اور اگر ایک اپنی عاقبت سنوارنے کا اہتمام کرتا ہے تو دوسرا اُس کی مدد کرتا ہے۔ اگر ایک کی بات دل کو کھٹکتی ہے تو دوسرا حُسن و خوبی کے ساتھ اس کو توجہ دلا دیتا ہے اس طرح آہستہ آہستہ پورا اجتماع باہمی خیر و خوبی کا تبادلہ کر کے حُسن و خوبی کا مرقع بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر ایک مسلمان کسی صحابی یا بزرگ کو اپنا آئیڈیل بنا کر اُس کی خوبیوں کو اپنے اندر پرورش کرنے کا معمولی اہتمام کرے تو اس سے بھی تربیت اور کردار کی اصلاح میں بڑی مدد ملتی ہے۔

خوب تر کی تلاش

ایک اچھے مسلمان کے لیے تربیت و اصلاحِ کردار کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے احباب و رفقا میں اخلاق و کردار اور دینداری اور تقویٰ میں اپنے سے بہتر بھائی پر نظر رکھے۔ اس کی خوبیاں اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرے۔ ایک مسلمان کو یہی حکم دیا گیا ہے کہ وہ دنیوی اُمور میں اپنے سے کم تر کی طرف دیکھے تاکہ دوسروں کی خوشنما دنیا دیکھ کر وہ لالچ اور حسرت میں مبتلا نہ ہو۔ اور دینی اُمور میں اپنے سے بہتر کی طرف دیکھے تاکہ اس کے ساتھ اپنے اخلاق و کردار کا موازنہ کر کے وہ اپنی کمزوریوں کو دُور کرے۔ اس کی خوبیوں کو اپنائے اور اپنے آپ کو سنوارنے کی تگ و دو

کرے - انسان غور سے دیکھے تو اُسے صاف دکھائے گا کہ اس کے چاروں طرف اس کے مختلف دینی بھائیوں میں اخلاق و کردار کے عمدہ عمدہ پھول کھلے ہوئے ہیں - کسی میں خدا ترسی ہے، کسی میں خوش خلقی ہے، کسی میں خدا کی راہ میں مال صرف کرنے اور انفاق فی سبیل اللہ کرنے کا جذبہ ہے، کسی میں عبادات کا شغف ہے، کوئی ذکر و اذکار میں منہمک ہے کوئی خلقِ خدا کی ہمدردی و خیر خواہی اور خدمتِ خلق میں آگے ہے، کوئی شفقت نرم مزاجی، خوش خلقی اور خوش مزاجی میں منفرد ہے - کوئی راتوں کا تہجد گزار ہے اور کوئی راتوں کا مجاہد فی سبیل اللہ اور دعوتِ حق میں سرگرم و سبک رفتار ہے - ایک اچھے مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آس پاس بکھری ہوئی ان خوبیوں کو سمیٹ سمیٹ کر اپنے کردار میں جمع کرتا جائے تاکہ وہ خود بھی ان ساری خوبیوں کا ایک دلآویز گلدستہ بن جائے -

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام مسلمان کے خصائل کا یہ بھی ایک حصّہ ہے کہ وہ خلقِ خدا کے اندر بالفعل نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے اور اس کام میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت اور کسی خوف دلانے والے کے خوف سے نہ دبے -

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم پر لازم ہے کہ نیکی کا حکم دو، بدی سے روکو اور بدکار کا ہاتھ پکڑ لو اور اسے حق کی طرف موڑ دو - ورنہ اللہ تمہارے دلوں کی بُرائیاں ایک دوسرے پر مسلط کر دے گا، یا تم پر اس طرح لعنت کرے گا جس طرح اس نے بنی اسرائیل پر کی" (ترمذی)

اِس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ مسلمانوں میں خیر کی شمع کو روشن رکھنے اور شر کی ظلمت کو رفع کرنے کا اہتمام جاری رہنا اشد ضروری ہے - اگر یہ کام نہ کیا جائے تو پھر ایسے لوگوں کو اللہ کے عذاب سے بچ نکلنا سخت مشکل ہے -

معاشرہ، تربیت و اصلاح کا سانچہ جب کوئی شخص نیکی کی تبلیغ اور فلاحِ انسانیت کا عزم و ارادہ لے کر اُٹھتا ہے تو صرف یہی نہیں ہوتا کہ تنہا وہی معاشرے کی اصلاح کا کام کرتا ہے، بلکہ خود معاشرہ بھی اس کے اندر معمولی سے معمولی کمزوری اور لغزش کی نشان دہی کر کے اسے ٹھیک ٹھیک اصلاح و درستی کے معیارِ مطلوب پر قائم ہونے اور رہنے پر مجبور کر دیتا ہے - ایک مسلمان متبع اس بات کی طرف

معاشرے کو لانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا، جس بات کا وہ خود اہتمام نہ کرتا ہو اور اس خرابی سے وہ کسی دوسرے کو بچا نہیں سکتا جس خرابی سے وہ بچنے کا وہ خود اہتمام نہ کر رہا ہو۔ اسی طرح جونہی وہ اپنی دعوت لے کر اُٹھتا ہے ہر طرف سے غور بینیں اس کے ایک ایک کام اور حرکت پر لگ جاتی ہیں اور اگر اس میں ذرا بھی ٹیڑھ ہو تو اسے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اس لیے کسی مبلغ اور داعی کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ بہت سی خرابیاں اپنے ساتھ لے کر معاشرے کی اصلاح کے لیے نکل کھڑا ہو۔ معاشرہ اس کے قول و فعل کو یک سو کر کے چھوڑتا ہے یا تو اسے اپنے قول کے مطابق خود بھی ڈھلنا پڑتا ہے یا پھر اسے اپنے قول سے ہی توبہ کرنا پڑتی ہے۔ اس لیے انسانی معاشرہ دعوتِ حق پیش کرنے والے کے لیے خود بھی ایک کسوٹی بن کر اس کی درستی اور راستی کا ضامن بن جاتا ہے۔ کبھی معاشرے کی تنقید سے اور کبھی اس کی مزاحمت اور آزمائش سے مبلغِ حق اپنے کردار کی ہر کجی کو دُور کر لیتا ہے اور بالآخر وہ اپنی دعوت کے لیے مخلص اور بے لوث ہو کر رہتا ہے۔ اس طرح مبلغ کے لیے معاشرہ خود ایک تربیتی کلاس اور اصلاح کا سانچہ فراہم کر دیتا ہے۔

نظامِ حق کے غلبہ کی جدوجہد

مسلمان کے ذرائع تربیت میں اس کی اخلاقی تربیت کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ وہ اس نظامِ حق کو بالفعل قائم کرنے کی عملی طور پر جدوجہد کا آغاز کرے جس کی حقانیت کی اس کا ایمان اور عمل دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے علمبردار کی اخلاقی تربیت کے بھی مختلف مدارج ہیں۔ جس طرح حدیث کی رُو سے ایمان کے مختلف درجے ہیں۔ اگر بُرائی سے روکنا ایمان کا پہلا درجہ ہے تو منکر کو روکنے والی قوت کی فراہمی یعنی اقامتِ دین کی جدوجہد بھی ایک مسلمان کے ایمان کا پہلا فرض ہے جس سے پہلو تہی کر کے اس کے دوسرے اعمال کی قدر و قیمت بھی گھٹ جاتی ہے جب تک یہ نیت نہ ہو کہ خدا کا کلمہ بلند کرنا ہے اور جب تک پیشِ نظر یہ منزل نہ ہو کہ دینِ حق کو ساری دُنیا میں غالب کرنا ہے اس وقت تک ایک مسلمان کی سیرت کا پورا پورا ظہور نہیں ہوتا۔ یعنی اس کے سارے گوشے نکھر کر اس طرح واضح نہیں ہوتے کہ اسلامی سیرت کی تکمیل ہو جائے۔

بلاشبہ یہ ضروری ہے کہ ایک داعیٔ حق میں ایمان کے سارے پہلو اور سارے مدارج موجود ہوں اور وہ اس کا اہتمام کرے کہ خدا پر ایمان، رسولوں پر ایمان، آخرت پر ایمان اور ایمان کے دیگر تمام گوشوں کو ہمہ پہلو مکمل کیے بغیر ایمان کے حقیقی تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ اسی طرح زبانی ایمان کا

اعتراف بھی کافی نہیں ہے، بلکہ اپنے آپ کو پورے طور پر اللہ اور رسول کا مطیع فرمان بنا دینا اور اس کے احکام پر سر جھکا کر بلا چون و چرا چل پڑنا بھی اتنا ہی ضروری ہے، ورنہ ایمان بلا عمل تو نفاق کا مظہر بن جاتا ہے۔ ایمان کے تقاضوں کے مطابق عمل کا نام ہی حقیقی اسلام ہے۔ یعنی عملی اطاعت کا زندگی کے ہر گوشے میں مظاہرہ کرنا ہی سچا اسلام ہے۔ پھر یہ مظاہرۂ اطاعتِ خداوندی بھی ایسا ہو کہ جس میں احساس و شعور و ضابطہ و تقاضائے حکم کا پورا پورا التزام و اہتمام موجود ہو جس میں خدا کا خوف صاف صاف جھلکتا ہوا دکھائی دے جس میں رسول اکرم کی محبت کی صورت نمایاں طور پر موجود ہو جس میں مومن اپنے پورے احساسِ ذمہ داری سے دینِ حق کی پیروی کا اہتمام کرے اور پورے طور پر تابع فرمانِ الٰہی ہو جائے۔ جو حکم وہاں سے ملے اس پر چل پڑے جس چیز سے روک دیا جائے اس سے رک جائے، کسی معاملہ میں اس کی مرضی کا دخل نہ رہے بلکہ وہ پورے طور پر خدا اور رسول کی مرضی کا تابع ہو جائے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب مکمل اسلام اپنی تمام جزئیات کے ساتھ نافذ ہو۔

مومن اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ جو بندہ اپنے مالک کی طرف چل کر جاتا ہے تو مالک جو رحیم و رحمٰن ہے اُس کی طرف دوڑ کر آتا ہے۔ یہی خصوصیت حاصل کرنا ہے۔

ایک سورۃ کی تفسیر پر کچھ معروضات

جناب پروفیسر آسی ضیائی صاحب

"زمانے کی قسم، انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔" (تفہیم القرآن جلد ۶)

الکوثر کے سوا، یہ قرآنِ حکیم کی سب سے چھوٹی سورۃ کی ترجمانی ہے، اور امام شافعی رحمہ کے مطابق انسان کی ہدایت کے لیے یہی تنہا سورۃ کافی ہے، لیکن اسے میری کوتاہ فہمی کہا جائے یا کیا، کہ مفسرین اس کی جس طرح تشریح کرتے رہے اس سے مجھے شرحِ صدر نہ ہو سکا۔

میں نے اس کی جو تفسیر پڑھی ہے اس کی رُو سے زمانے کی قسم میں نہ صرف پہلی بات (انسان بڑے خسارے میں ہے) شامل ہے بلکہ اس قسم کا اطلاق اس کے بعد کے استثناء پر بھی ہوتا ہے یعنی زمانہ اس بات کا بھی گواہ ہے کہ انسان خسارے میں ہے اور اس بات کا بھی کہ ایمان و عملِ صالح کرنے والا اور تواصی بالحق اور تواصی بالصبر پہ عمل پیرا انسان اس خسارے سے محفوظ ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس کا یہی مفہوم ہوتا تو یہ نہ عہدِ رسالت کے سادہ ان پڑھ بدو کو قائل کر سکتا اور نہ آج کے بزعم خود فاضل دانشور کو۔ ایک بدو یہ کہہ کر جھٹلا سکتا تھا کہ جو لوگ آج اللہ، رسولؐ اور یومِ آخرت پہ ایمان لا رہے ہیں، نیک کام کر رہے ہیں، ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کر رہے ہیں، اُ نہی کو

زمانے کی گواہی کے مطابق ہر طرح کا خسارہ بھگت رہے ہیں۔ ان کی معاشی حالت پتلی ہو گئی ہے، معاشرتی مقام سے یہ محروم ہو گئے ہیں، زمین و آسمان ان کے دشمن ہو گئے ہیں۔ ہر طرف سے یہ دھتکارے اور پھٹکارے جا رہے ہیں ___ یہ کیسا نفع ہے جو انہیں مل رہا ہے؟ ان کے برعکس، جو شیوخ اور سرمایہ دار نہ ایمان لائے، نہ نیک کام کرتے ہیں، بلکہ اُلٹا، دنیا کا ہر بُرا کام کرنے میں پیش پیش ہیں، زمانہ گواہی دے رہا ہے کہ یہی ہر طرح کے فائدے سمیٹ رہے ہیں (واضح رہے کہ یہ سورۃ مکی دور کے بھی ابتدائی عرصے میں نازل ہوئی تھی۔ مدینے میں مسلمانوں کا عروج ابھی کسی کے تصور میں بھی نہ آیا تھا)۔

اور آج کا فلسفی دانشور یہ کہہ کر اسے ٹال سکتا ہے کہ دنیا میں عروج اور ترقی صرف اہل ایمان کی اجارہ داری تو نہیں، وہ قومیں بھی باری باری خوش حالی اور نفع اندوزی کا مزہ چکھ چکی ہیں جو مشرک یا بے دین تھیں: قدیم دور میں عراق، مصر، چین، روم و یونان وغیرہ اور موجودہ دور میں یورپ، امریکہ اور اشتراکی روس بھی مادی منافع و خوش حالی سے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر متمتع ہو رہی ہیں۔ پھر اس میں مسلمانوں کی کیا خصوصیت ہے کہ ان کے بارے میں دعویٰ کیا جاسکے کہ وہ خسارے سے بچے ہوئے ہیں۔ اور اگر اس سورۃ میں انسان سے مراد قومیں اور ممالک نہیں، انسانی افراد ہوں تب بھی زمانہ یہ گواہی نہیں دیتا کہ مسلمان ہو جانا اور مذکورہ خوبیاں اپنے کردار و عمل میں پیدا کر لینا خسارے سے محفوظ رہنے کی ضمانت ہے، اس کے برعکس زمانے کی گواہی تو عموماً یہ ہوتی ہے کہ ایمان لاکر ایک انسان خسارہ ہی مول لیتا ہے۔

یہ سب اعتراضات و اشکالات اس صورت میں پیدا ہوتے ہیں جب زمانے کی گواہی میں اس تیسری آیت کے استثنا کو بھی شامل کر لیا جائے۔ اس کے برخلاف میری ناقص رائے میں زمانے کی گواہی صرف اتنی ہی ہے کہ "انسان بڑے خسارے میں ہے"۔ اس کے بعد کا استثنا ___ ایمان لانے، عملِ صالح کرنے اور حق و صبر کی باہم تاکید کرنے والوں کو خسارے سے بچ نکلنے کی بشارت ___ براہِ راست اللہ رب العالمین کا وعدہ ہے۔

چنانچہ میرے نزدیک سورہ العصر بیک وقت حق کے منکروں کو فہمائش بھی ہے اور اہلِ ایمان کو تسلی بھی۔ اور میں اس کے نزول کا پس منظر اس طرح سمجھتا ہوں کہ ابتدائی مکی دور میں، جب مٹھی بھر ایمان لانے والے آزمائشوں میں گھر چکے تھے، معاشرے میں انہیں نکو بنا دیا گیا تھا، ان کا کاروبار ختم

ہوتا جا رہا تھا۔ اور انہیں طرح طرح سے ذہنی اور جسمانی ایذا دہی کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اُس وقت اُس معاشرے کے کھاتے پیتے لوگوں اور ان نئے نئے مسلمان ہونے والوں کے دوستوں اور عزیزوں نے طنزاً یا از راہ ہمدردی ان سے کہا ہو گا کہ تم کیوں خود کو مصیبت میں ڈالتے ہو اور کیوں زمانے کی روش کے خلاف چلتے ہو؟ دیکھو زمانہ گواہی دے رہا ہے کہ تم لوگ خسارے کا سودا کر رہے ہو؛ جو لوگ اِس وقت سربراہ اور خوش حال بنے بیٹھے ہیں اور ہر طرح کے فوائد سمیٹ رہے ہیں، انہی کا تم بھی ساتھ دو، ورنہ زمانہ تمہیں ختم کر کے رکھ دے گا۔

اس طرح کی باتیں سنتے سنتے مسلمانوں کو بھی اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ اضطراب قدرتاً ہوا ہو گا۔ اور نہ بھی ہوا ہو گا تو کم از کم ان باتوں کا جواب تو ظاہر ہے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ مختصر اور بلیغ جواب دیا گیا کہ زمانہ تو پوری نوعِ انسان کے خسارے کی گواہی دے رہا ہے: کہاں ہیں وہ بڑے بڑے بادشاہ، حکیم، سپہ سالار، دولت مند، اور ہر طرح کے اعلیٰ افراد نے افرادِ انسانی جو کبھی اسی کرۂ ارضی پر پھلتے پھولتے رہے تھے؟ موت نے آ کر سب کو خسارے سے دوچار کر دیا، ان کی فرمانروائی، علم و عقل، دلیری و جنگ جُوئی، مال و دولت، ذہنی و بدنی طاقتیں، سب آخر کار قصۂ ماضی ہو کر رہ گئیں۔ کونسا انسان ہے وہ جو اپنی کسی متاع سے موت پر قابو پا سکا ہو؟ اور کون سی قوم ہے وہ جو اپنے انتہائی عروج پر پہنچ کر، جلد یا بدیر، زوال کی طرف بڑھنے سے رُک سکی ہو؟ انسانیت کا یہ سارا قافلہ تو خسارے ہی کی طرف رواں دواں ہے۔ موت کے بعد کسی شخص کا ذکرِ خیر، یا اُس کے نام پر دُنیا بھر کی خیرات بھی اس کے لیے نفع بخش نہیں ہو سکتی۔ اپنی محدود مدتِ زندگی میں جو کچھ وہ کھا پی چکا، پہن اوڑھ چکا اس کے سوا کچھ بھی اس کے کام نہیں آتا۔ لہٰذا زمانے کی گواہی یہ نہیں کہ اہلِ ایمان نے اپنی چند روزہ زندگی میں کچھ مصائب جھیلے، یا منکرین نے اسی عارضی حیاتِ دُنیوی میں کچھ مزے اُڑا لیے، بلکہ زمانے کی گواہی دراصل یہ ہے کہ تمام انسانوں کا انجام ایک بڑے خسارے میں جا پڑنا ہے، جس کے بعد نفع کی کوئی صورت نہیں۔ گویا دُنیاوی اور مادی نقطۂ نظر سے، جس کو حق کے تمام منکرین اصل حق سمجھتے ہیں، انسان اس بڑے خسارے سے بچ نہیں سکتا۔ اور مادہ پرست انسان کے لیے یہ بڑا خسارہ موت ہی ہو سکتا ہے ــــــ زمانے کی گواہی یہاں پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ زمانے نے اہلِ ایمان کا عروج بھی دیکھا ہے۔ پھر بھلا وہ اس کی گواہی کیوں

نہیں دے سکتا ؟ تو جواب میں ایک ملحد کہہ سکتا ہے کہ یہ عروج و زوال تھوڑے سے بہت فرق کے ساتھ وہ قومیں بھی دیکھ چکی ہیں جن کے پاس نہ ایمان تھا نہ عمل صالح وغیرہ۔ اس میں مومنین کی کیا تخصیص ہے۔
البتہ اگر بڑے خسارے کا مفہوم "موت" لیا جائے اور زمانے کی گواہی بعد کے استثنا تک محیط نہ مانی جائے تو یہ ایک ایسی حقیقت ہو گی جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا: یعنی "زمانہ گواہ ہے کہ انسان کی نوع موت کے بڑے خسارے میں پڑ جاتی ہے"۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دے دیا ہے یعنی ان لوگوں کے لیے موت کوئی خسارہ نہیں جن میں یہ چار صفات پائی جاتی ہوں، کیونکہ وہ آخرت کی ابدی زندگی میں عیش ہی عیش کرتے رہیں گے۔ اس دائمی پُر تعیش زندگی کی گواہی زمانہ نہیں دے سکتا، کیونکہ یہ عالمِ آخرت کے احوال میں سے ہے۔ اور آخرت میں "زمانہ" (العصر) کا وجود ہی نہ ہو گا۔

قرآن فہمی کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے میں نے اپنی یہ گذارشات اہلِ علم کے سامنے اس لیے لا رکھی ہیں کہ اگر ان میں کوئی غلطی یا کوتاہی ہو تو براہ کرم اس کی نشاندہی کر دی جائے تاکہ میری اصلاح ہو سکے۔ اور اگر اہلِ علم اس سے متفق ہوں تو اس سورۃ کی تفسیر میں یہ وضاحت کر دی جائے۔ وما علینا الا البلاغ۔

رسائل و مسائل

تنگ حال رفقاء سے تحریک کی اعانت طلبی

نعیم صدیقی

سوال: ۔میں ایک عام مسلمان ہوں اور ایک مسئلہ بہت اہم درپیش ہے ۔ وہ یہ ہے کہ میرے ایک دفتر کے ساتھی مجھے مسلسل اس بات پر مطعون کرتے ہیں کہ میں جماعتِ اسلامی کے بیت المال میں چندہ نہیں دیتا جب کہ میرا استدلال یہ ہے کہ میری آمدنی بہت قلیل ہے جس میں میرے والدین، میری تین بہنیں، میری بیوی اور پانچ بچے پورا ماہ بھی گزارہ نہیں کر سکتے۔ عموماً ۱۵ سے ۲۰ دن کے بعد قرض لینے کی نوبت آجاتی ہے ۔ پھر ساتھ ساتھ اعزہ میں ایسے لوگ بہت کثیر تعداد میں ہیں جو کہ مستقل پریشانیوں میں مبتلا ہیں، جن کی امداد کے بعد مجھے کئی کئی دن بلکہ کئی کئی ماہ اپنی جائز ضروریات یعنی کپڑا، دوا علاج بھی ٹالنا پڑتی ہے ۔ ۵ بچوں کے دوا علاج، تعلیم وغیرہ پر اتنا خرچ اٹھ جاتا ہے کہ گذشتہ تین ماہ میں ایک دو دفعہ کرایہ نہ ہونے کی وجہ سے ۶ میل پیدل چل کر بھی دفتر پہنچا ہوں ۔

میرا استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق جو فرض کیے گئے ہیں ان کے بعد اگر میرے پاس ایک پیسہ بھی بچ رہے تو میں ضرور دوں گا، مگر ایسی صورت میں جب کہ ان کی بنیادی ضروریات بھی پوری کرنے سے قاصر ہوں، بلکہ پہلے کے اثاثے بیچ کر گزارہ کر رہا ہوں تو پھر میں اس اعانت سے معذور ہوں ۔

ہمارے محاسب صاحب جو کہ جماعتِ اسلامی کے سرگرم کارکن ہیں ان کا اصرار ہے

کہ قرآن کا یہ حکم جماعتِ اسلامی کے بیت المال قائم ہونے کے بعد ساقط ہو گیا ہے یعنی والدین، اقرباء، یتامیٰ، مساکین کے لیے انفاق، بلکہ صحیح حکم یہ ہے کہ پہلے جماعت اسلامی کے بیت المال میں دیں۔

مجھے آپ سے اس بارے میں وضاحت درکار ہے۔

جواب :-

مکرمی و محترمی! السلام علیکم

گرامی نامہ ملا۔ آپ کی مجبوری تھی کہ آپ کو ذاتی احوال لکھنے پڑے، ورنہ اتنی تفاصیل سامنے نہ آتیں اور آپ کا پردہ رہتا تو اچھا تھا۔ میرے نقطۂ نظر سے آپ کے اٹھائے ہوئے سوالات کے جواب درج ذیل ہیں:

۱۔ ہمارے تحریکی دوستوں کو، خصوصاً سرکردہ حضرات کو باہم دگر ایک دوسرے کے حالات سے اتنا ضرور آگاہ ہونا چاہیے کہ وہ مناسب رائے دوسروں کے متعلق قائم کر سکیں۔ اس کا طریقہ رابطہ ہے جو نہ تو سرا سر قسم کا ہو، نہ دفتر و اجتماعات سے متعلق، بلکہ ایک محبت آمیز نجی تعلق، قدرے بے تکلفی، ایک دوسرے کو ذاتی سطح پر جاننے سمجھنے کی کوشش مطلوب ہے۔

۲۔ آپ اگر اپنے حالات میں گنجائش نہ پاتے ہوں تو محض دوسروں کے تقاضوں اور دباؤ سے خرچ کرنا ضروری نہیں ہے، استطاعت ہو تو خالصتہً للہ خرچ کرنا چاہیے۔

۳۔ ایک امر بطور مشورہ! تحریک سے تعلق اور خدا سے محبت بڑھانے کے لیے آپ یہ ضرور کر سکتے ہیں کہ مثلاً ایک روپیہ یا آٹھ آنے یا چار آنے یا چندہ سے ادا کرتے رہیں تاکہ آپ کو یہ تسکین حاصل رہے کہ نظم و دعوت کے مالی مصارف کے بہتے دریا میں آپ کا بھی حصہ ہے۔

علاوہ ازیں جسمانی یا دماغی قوتوں سے تحریک اور دوسرے انسانوں کی خدمات سر انجام دی جا سکتی ہیں۔

۴۔ میری رائے یہ ہے کہ والدین، اقرباء، پڑوسی، مصیبت زدہ افراد وغیرہ کے حقوق اپنی جگہ رکھتے ہیں، اور تحریک ان کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ مثلاً خدمتِ والدین پر آپ اگر خرچ کرتے ہیں تو تحریک یہ مطالبہ نہیں کر سکتی کہ اس خرچ کو بند کر کے تحریک کو ادا کرو۔ نہ یہ مناسب ہے کہ آپ والدین پہ جو خرچ کرتے ہیں، وہ پہلے بیت المال میں داخل کریں، پھر بیت المال کا کوئی آدمی آپ کے والدین

کے پاس جا کر رقم ادا کرے اور رسید پرچہ بنائے۔ چھوٹے چھوٹے روزمرہ معاملات اگر یہ شکل اختیار کر لیں تو ایک طرف جماعت پر دفتری بوجھ بڑھے گا اور دوسری طرف دفتریت کے چکر سے ہو کر حق بحق دار تاخیر سے پہنچے گا۔ علاوہ ازیں بعض شرفا بہت ہی قریبی لوگوں سے پردے میں تو کچھ لے لیتے ہیں، اگر عام دفتری یا اجتماعی سطح پر اپنا بھرم گنوانے پر تیار نہیں ہوتے۔ بہرحال فرض کردہ حقوق کی ادائیگی کو تحریک ساقط نہیں کر سکتی۔

اسی طرح آپ کے سامنے کوئی آدمی بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ آپ نے اُسے ٹیکسی پر لدوا کر ہسپتال پہنچایا۔ اور اس کا خرچہ بھی ادا کر دیا اور جسمانی محنت بھی اُٹھائی۔ اور وقت کی قربانی بھی دی۔ کوئی ضرورت نہیں کہ آپ اس طرح کے مصارف کا گوشوارہ بنا کر پیش کرتے رہیں۔ ایسا عمل آپ کے ذریعے از خود دعوتِ حق کے فروغ کا ذریعہ بنے گا۔

(بقیہ: اسلام میں اختلاف کے آداب)

کسی حقیقت کا اظہار اس کی اپنی زبان سے ہو رہا ہو یا اس کے بھائی کی زبان سے۔

۶- وہ اسلام کے عام آداب کی پابندی کرتے ہوئے دورانِ گفتگو اچھے کلمات کا انتخاب کرتے، جارحانہ اور سخت الفاظ کے استعمال سے گریز کرتے۔ اور دوسرے کی بات بغور سنتے۔

۷- وہ خواہ مخواہ کے جھگڑنے سے حتی الوسع پرہیز کرتے، موضوع زیر بحث کے بارے میں اپنی پوری کوشش صرف کرتے جس کی بنا پر ہر فریق دوسرے کی رائے کو سنجیدگی سے سنتا اور اس کا پورا پورا احترام کرتا اور یا تو اسے قبول کرنے پر مجبور ہوتا یا اس سے بہتر رائے پیش کرنے کی کوشش کرتا۔

یہ وہ چند خاص آدابِ اختلاف ہیں جو عہدِ رسالت میں پیش آنے والے واقعات کے مطالعے سے سامنے آتے ہیں۔

مطبوعات

مسافرانِ عدم | از جناب سید اسعد گیلانی، ایم-این-اے - ناشر: حسنات اکیڈمی - ۱۹ اسی منصورہ، لاہور ۱۸

کاغذ، کتابت، طباعت دلکش، جلد ستھری ڈائی کے ساتھ - ضخامت: ۵۲۴ صفحات -
قیمت: -/۷۰ روپے

علمی، ادبی اور سیاسی حلقوں میں جناب سید اسعد گیلانی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں - ان کی متعدد تصانیف شائع ہو کر پذیرائی حاصل کر چکی ہیں - زیرِ نظر کتاب میں سید صاحب نے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے والے اساتذہ کرام، رفقائے گرامی، احبابِ عزیز اور اقربائے محترم کے تذکرے پیش کیے ہیں خصوصاً مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مولانا مسعود عالم ندویؒ، چوہدری غلام محمد، مولانا ماہر القادری، ڈاکٹر نذیر احمد شہید، جناب مصباح الاسلام فاروقی، حکیم اقبال حسین، مولانا گلزار احمد مظاہری، سید غلام رسول شاہ، سید صدیق الحسن گیلانی اور خالد صدیقی کے احوال و مقامات کا بیان نہایت اہم ہے -

جن مسافرانِ عدم کی زندگیوں کی جھلک دکھائی گئی ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے سامنے چل پھر اور ہنس بول رہے ہیں - مزید برآں یہ کتاب محض چند شخصیتوں کا تذکرہ ہی نہیں بلکہ تحریکِ اسلامی کی ایمان افروز داستان کا عکس بھی لیے ہوئے ہے - اس میں اتنی دلچسپی اور جاذبیت ہے کہ ایک دفعہ شروع کرنے کے بعد ختم کیے بغیر اسے ہاتھ سے رکھنا مشکل ہے -

---

التحقیق الصحیح | از حضرت قاضی محمد صدر الدین ؒ۔ ملنے کا پتہ: خانقاہ نقشبندیہ، مجددیہ، ہری پور ہزارہ

قیمت: جناب مؤلف کے لیے رفع درجات کی دعا۔

الطاف حسین کے عزائم اور ارادے | مصنف و مرتب کا مذکور نہیں۔ پبلشرز: شبل پبلیکیشنز لمیٹڈ سیکنڈ فلور، عظمی آرکیڈ۔ مین کلفٹن روڈ، کراچی۔ قیمت: ۲۰/- روپے

جب کوئی نئی شخصیت ابھرتی ہے، نیا انداز اختیار کرتی ہے۔ اور نئے فدائیوں کو سامنے لے کر آتی ہے تو ہر کوئی مجبور ہوتا ہے کہ دلچسپی لے اور توجہ کرے۔

مسئلہ اب تک اتنا ہی تھا کہ چار قومیتوں کے فلسفے کا جادو کس طرح ٹوٹے کہ پاکستان سب کے لیے ایک مشترک قومی گھر کی حیثیت حاصل کر سکے۔ الٹا بیچ میں پانچویں قومیت کا جھنڈا کھڑا ہو گیا۔

ویسے الطاف حسین صاحب نے زمانہ طالب علمی سے لے کر آج تک کی کڑک دار لیڈری تک کا فاصلہ طے کرنے میں جس جذبے سے کام لیا ہے، وہ ضرور قابلِ داد ہے۔ ایک شخص نے سیاسی اسٹیج پر نہایت اونچی جگہ کھڑے ہو کر دکھا دیا کہ اس کی آواز بہت بڑی تعداد کی آواز ہے۔

آپ آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک فرسٹریشن ہے۔ یونہی سہی، مگر اس کو پیدا کرنے کے اسباب کس نے مہیا کیے؟ کراچی کی مختلف آبادیوں کو سمجھنا، علاقہ وار مسائل کو جاننا، سندھی، پنجابی، مہاجر کے حقوق میں توازن پیدا کرنا، نوجوانوں کو اسلامی نظامِ عدل و احسان کا آدرش دلانا اور اس کے ساتھ اس آدرش کے مطابق ان سے اور ملک کی آبادی سے سلوک کرنا اور اسی آدرش کے مطابق ادارے بنانا اور چلانا، یہ ان لوگوں کا فریضہ تھا جو اقتدار اور سیاست پر قابض چلے آ رہے تھے۔ لیکن جب ان لوگوں نے ایسی ذمہ داریوں سے ہمیشہ روگردانی کی اور کسی کی بھی حق طلبی پر بہلاوے بتائے اور کھوکھلے لفظوں سے کام چلانا چاہا تو ہمارا پورا ملی نظامِ وحدت ہی کھوکھلا ہوتا چلا گیا۔ منافقت اور تضاد کے رویے ہمیشہ اضطرابات پیدا کرتے ہیں۔ ہمیشہ انتہا پسندانہ نظریات ابھارتے ہیں۔ جس قسم کا سرابی ماحول کارپردازوں نے برسوں سے بنا رکھا تھا اس کے اندر سے جس طرح جی ایم سید اور ولی خان

نمودار ہوئے ہیں، لازم تھا کہ الطاف حسین بھی نمودار ہوں - اور ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہماری اسلامی ریاست کے والی لادینیت کے ذوقِ رندانہ کی سرمستی میں نظامِ شریعت کے خلاف جو لڑائی لڑ رہے ہیں، وہ اور کیا کیا فتنے اُبھارے گی - جب کوئی اجتماعی نصب العین دیانت داری سے اپنے اوپر اور قوم پر سایہ فگن نہ کیا جا سکا ہو تو پھر پتا نہیں ہوتا کہ خود رَو چیزیں کیا کیا اُگیں گی - ابھی تو ہم اونٹ کٹارا کو روتے ہیں، کل یہاں شجرۃ الزقوم بھی نمودار ہو سکتا ہے - اور اس کی ساری ذمہ داری ہمارے چالیس سالہ کارپردازوں کی ہوگی - پڑھیے -

سہ چہل سالِ عمرِ عزیزت گذشت

ہمیں ہر مظلوم شخص اور ہر مظلوم گروہ سے دلی قرب اور سچی ہمدردی ہے، مگر ہم اس فارمولے کو سمجھ نہیں سکے کہ جس گروہ کو کوئی شکایت ہو وہ پاکستان بھر کے خلاف بپھر کر اُٹھ کھڑا ہو اور یا تو علیحدگی پسندی کی کلاشنکوف تان لے اور یا ایک نیا طوفانِ تصادم برپا کر دینے کے لیے پستول نکال لے - ہر کوئی اپنے مظلوموں کے ٹولے الگ الگ اکٹھے کر رہا ہے - آخر تم سب لوگ سارے ہی مظلوموں کو اپنا کیوں نہیں سمجھتے اور ان سب کے لیے اکٹھے ہی آواز کیوں نہیں اُٹھاتے -

بصورتِ موجودہ مختلف لسانی، نسلی اور علاقائی گروہوں کی عصبیتوں کے بڑھتے ہوئے نشے کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ طرح طرح کے ٹکراؤ اور تصادم پیدا ہوں اور ان کی چند لہریں سامنے آ چکی ہیں -

الطاف حسین صاحب سے پوچھا گیا کہ:

"اس مسئلے کا حل کیا ہے"

الطاف حسین: "ان قومیتوں کے حقیقی نمائندوں سے بات چیت اس مسئلے کا حل ہو سکتی ہے - مجھے یا دوسروں کو الزام دینے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا" - (ص ۵۱)

یعنی عطرِ مباحث یہ نکلا کہ کوئی کسی کو الزام دے کر کسی مسئلے کو حل نہیں کر سکتا - حل کا راستہ صرف افہام و تفہیم ہے - جن مباحث کا یہ خطر ہے اُن کو آپ اس کتاب میں پڑھیے - طوفانی اور آتشیں الفاظ کی گولہ باریاں ہیں - جمعیت اور جماعت کے خلاف بہت گرم ملا اُچھالا گیا ہے، اگرچہ جی - ایم سید کے لیے گوشہ خاصا نرم ہے - اتنی گنجائش ہمارے پاس نہیں کہ ہم اس کتاب کے مندرجات کے تضادات کو نمایاں کر سکیں - خود بغور پڑھیے - یہ سب "سن آف دی سوائل" کے نکتے کی تفسیریں ہیں اور اس نکتے کی وجہ سے مسلمان

کئی سرزمینوں میں ختم کیے جا رہے ہیں۔ اور مہاجر بن رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آل ورلڈ مہاجر موومنٹ چلنی چاہیے۔ اور کیا معلوم کل الطاف صاحب ہی اس کے سربراہ ہوں۔

ہم تو صرف اس چیز کے قدردان ہیں کہ کوئی صاحب انسانیتِ اعلیٰ کے موقف پر ایستادہ ہوں اور کہیں کہ میں خدا پرستانہ تڑپ کے ساتھ نیکی کی خدمت اور بدی کی مزاحمت کے لیے اٹھا ہوں۔ کوئی بھی راستی کا خادم اور امن پسند اور مجسمۂ شرافت ــــــ خواہ وہ سندھی ہو، یا مہاجر یا پٹھان یا پنجابی یا بنگلہ دیشی وہ میرا ہے۔ اور کوئی بھی بدی کا مریض، خواہ وہ پنجابی ہو یا بلوچی یا سرحدی یا سندھی یا کراچوی یا مہاجر، وہ میرا نہیں ہے۔ مہاجر اگر قاتل ہو، سندھی اگر ڈاکو ہو، پٹھان اگر سمگلر ہو، پنجابی اگر لٹیرا ہو، بلوچی اگر سازش کرے تو ان میں سے کوئی بھی میرا نہیں ہے۔

یہ ہے اصل اصول جمع ہونے اور کٹنے کا، جو انبیاء کا تعلیم کردہ ہے۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ الطاف حسین ہوں یا کوئی اور طوفان خیز لیڈر، کاش کہ وہ انسانوں کو کاٹنے والی سیاسی وادیوں کی آوارگیوں کو چھوڑ کر اسلامی اصولِ اجتماع کا علم اٹھا کر لوگوں کو حق کی حفاظت اور ظلم کے ازالے کے لیے شاہد و مجاہد بنائیں۔

صرف یہ چیز آخرت تک باقی رہے گی، باقی سب کچھ موسمی گھاس کی طرح سوکھ سڑ جائے گا۔

اب بھی میں اپنے ہم خیال قریبی دوستوں سے کہتا ہوں کہ "ایام کی گردش تیز کر دو"۔ اور اتنا بھرپور کام جلد جلد کر دکھاؤ کہ بستی بستی محلے محلے اسلام کے ایسے باشعور فداکاروں کی کمیٹیاں اور حلقے بن جائیں، جن کے ہوتے ہوئے نسلیت اور علاقائیت کی لہر اور عصبیتوں پر مبنی فسادات کے طوفان عوام کو لپیٹ میں نہ لے سکیں۔ اور نہ ہر وقتی نعرے کا جادو ان کو اپنی گرفت میں لے سکے۔ اس پہلو سے اگر حق کا کام کمزور رہے گا تو باطل کو خونِ انسانی کے جام چھلکا کر رقص کرنا ہی ہوگا۔ آیا لوگوں کو آپ بہتر عزائم اور ارادے دے سکتے ہیں؟

آغازِ اسلام میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم | از پروفیسر سید محمد سلیم۔ ناشر: ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ، پاکستان

پتہ: ۸-اے، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور۔ کاغذ سفید، رنگین سرورق۔ قیمت: ۱۰/- روپے

مختصر سی کتاب بہت سے اہم نکات سے بھری ہونے کی وجہ سے اتنی مقبول ہوئی کہ اب

تیسرا ایڈیشن ہمارے سامنے ہے۔

اس کتاب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین اور بنو امیہ کے دور میں مسلم معاشرے میں توسیعِ تعلیم کے لیے جو کوششیں ہوئیں اور جو طریقے اختیار کیے گئے۔ ان کا تذکرہ سید صاحب نے محققانہ انداز میں کیا ہے۔

قرآن خزانہ علم ہونے کے ساتھ ساتھ علمبردار تعلیم بن کر آیا۔ اور اقرا کی آواز فضا میں گونج اٹھی۔ علم کی فضیلت کے متعلق ص ۱۴ پر ایک آیت کے ساتھ چند احادیث درج ہیں۔ طالبِ علم کے درجات کے متعلق مزید احادیث ص ۱۵ پر ہیں۔ اسی طرح بچوں کے والدین کو، خادموں کے مالکوں کو، طلبہ سے اساتذہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تاکیدیں فرمائیں وہ بھی شاملِ تحریر ہیں۔ پھر نصاب اور طریقہ تعلیم اور مقصدِ تعلیم و تربیت اور خواتین اور نسوان کی تعلیم کے متعلق اہم تعلیمات مذکور ہیں۔ پھر حرم مکہ، مسجد نبوی، جامع مسجد بصرہ، جامع مسجد کوفہ، جامع مسجد عمرو بن العاص اور پھر خلافتِ بنو امیہ کے مکتبوں کا ذکر ہے۔

آذربائیجان کی ایک چھاؤنی کے مسلمان مجاہدین کو حضرت عمرؓ نے بذریعہ خط جو تربیتی ہدایات دیں، اُن کی مختصر سی جھلک:۔

> جوتے پہنا کرو، چمڑی موزے اتار دو۔ نشانہ بازی کی مشق کرو۔ رکابیں کاٹ دو، اپنے لڑکوں کو تیراکی کی مشق کراؤ۔ گھوڑے کی پیٹھ پر اچھل کر بیٹھا کرو۔ دھوپ کھایا کرو۔ یہ عربوں کا حمام ہے۔ عربی میں بات چیت کرو۔ موٹا پہنو، موٹا کھاؤ۔ مشقت اور جفاکشی کی عادت ڈالو، بھائیوں کی طرح رہو۔ عیش و تنعم کی زندگی سے بچو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم پہننے سے منع فرمایا ہے۔

یہ تھی آواز، پوری قوم کے مربی و معلم کی۔ کاش کہ آج کی کوئی مسلمان حکومت یہ راستہ اختیار کرسکتی۔

رسالہ "ساتھی" ایڈیٹر: مسعود کمال عباسی (مع مجلس مشاورت) پتہ: ساتھی پبلیکیشنز، الیف - ۱۰۶ - گلشنِ اقبال B/۱۳، کراچی ۴۷
قیمت: ایک روپیہ فی شمارہ

اس رسالے کے دو تین شمارے ہمیں موصول ہوئے ہیں - یہ اسکولوں کے طلبہ کے لیے جاری کیا گیا ہے - قابل قدر بات یہ ہے کہ جہاں اسالیب و عنوان جدید ضروریات کے مطابق دلچسپ ہیں - وہاں روحِ فکر بہت پاکیزہ ہے - معصوم بچوں کے ہاتھوں میں جو لوگ غلط رجحانات کی طرف لے جانے والا لٹریچر دیتے ہیں - ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ہیروئن فروش معصوم بچوں کو زہریلی عادت میں مبتلا کر دے -

مغربی ایڈ اور ہدایات کے تحت خاندانی منصوبہ بندی کے فتنے کو پاکستان میں پھیلانے کے لیے "ساتھی" کا جو کوڈ ورڈ استعمال کیا گیا ہے، خدا کرے کہ اس رسالے سے اس کا تعلق نہ ہو -

---

رسالہ پیغام مدیر: تنویر شہزاد و ۲ نائب مدیران - مقام اشاعت: ۱-اے ذیلدار پارک اچھرہ، لاہور - قیمت: فی شمارہ ایک روپیہ -

بہت اچھے مضامین کے ساتھ یہ بھی ایک نوخیز رسالہ ہے اور اس کا دائرہ بھی اسکولوں کے طلبہ ہیں - ایک طرف ایسے مضامین جو جدید دور کی معلومات اور ایجادات اور مسائل کا تصور دلاتے ہیں اور دوسری طرف ایسا مواد بھی ہے جو ایمان اور اخلاق کے تقاضوں کی آبیاری کرتا ہے - نظم و نثر دونوں میدانوں میں لڑکوں کی نفسیات کا لحاظ بھی رکھا گیا ہے اور زبان بھی آسان ہے -

---